راستے مجھے بلاتے ہیں

افسانے



عذرا عباس

نظم و نثر کے نئے انداز

دنیا زاد

کتابی سلسلہ

سال میں تین کتابیں

خصوصی کتابیں

عاشق من الفلسطین

تاریخی، سیاسی، سماجی تجزیہ

شعرو افسانے کے انتخاب کے ساتھ

دنیا دنیا دہشت ہے

تجربے سے تجزیے تک

شہرزاد
SCHEHERZADE

راستے مجھے بلاتے ہیں

افسانے

عذرا عباس

شہرزاد
SCHEHERZADE

Raastey Mujhey Bulatey Hain

(short stories)

Azra Abbas

اشاعت: ستمبر ۲۰۰۱ء
کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی
طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر

SCHEHERZADE

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
scheherzade@altavista.com

انتساب

اس کتبے کے نام
جس پر لکھا ہے

”یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے
اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے
سارے اسرار و رموز دفن ہیں۔
وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے
کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا“

ترتیب

گرگٹ کا کھیل

کسی پر بھی ناگہانی آسکتی ہے۔

اس پر بھی جو بہت گھنے پیڑوں کی شاخوں میں ادھر ادھر پھدکتا پھر رہا تھا۔ بہت دنوں سے رنگ بدل بدل کر رہ رہا تھا۔ اور آج جب رات کے اندھیرے میں نئے بجلی کے تاروں پر بلب جل رہے تھے۔ وہ اپنی گردن اُچکا اُچکا کر زمین گھورتے ہوئے بلب کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا چلتی تو تار ملتے اور بلب ہل جاتا اور وہ پھدک کر دوسری شاخ پر۔

یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے یہ روشنی آج پہلی بار نہیں دیکھی تھی۔ اکثر یہ بلب جل جاتے۔ اکثر اندھیرا بھی رہتا۔ لیکن جب کبھی یہ بلب جل جاتے تو وہ یہاں اتنے قریب نہیں ہوتا۔ وہ کہیں دور کسی اور درخت کی شاخ پر کیڑوں کو کھانے میں مصروف ہوتا۔

لیکن ایکا ایکی یہ کیا ہوا۔ بچوں کے قہقہوں کی آوازیں اور شور۔ اب وہ بلب نہیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر سے ادھر بہت سے بچے بھاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ننھی سی گول گول، سفید چیز لڑھک رہی تھی، ادھر سے ادھر اور کبھی بالکل اس کے منہ سے چھو جاتی۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ ان بچوں کے کھیل میں شریک ہے۔ جب بچے اس گول سفید چیز کو اوپر اچھالتے تو وہ بھی اس کے قریب ہونے کے لیے اچھل کر اس شاخ تک جا پہنچتا جس کو وہ سفید چیز چھو رہی ہوتی۔

وہ خوش ہو رہا تھا۔ ان بچوں کو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ ان کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

سفید گول گول چیز تنک تنک زمین پر گرتی اور اوپر ہوتی۔ کبھی ایک ہاتھ میں کبھی دوسرے میں اور کبھی اس کے منہ کو چھوتی ہوئی۔ لیکن ایک دم اچانک وہ سفید سفید گول چیز اس کے بالکل اوپر آ کر گھنے پتوں میں اٹک گئی۔

بچے ادھر ادھر اوپر نیچے ڈھونڈنے لگے۔ ایک شور ہا ہا کا اٹھا۔ اور پھر تجسس، کہاں گئی۔ کہاں ہے۔ اوپر رہ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ وہ ان کے کھیل میں شریک تھا۔ اور گول گول چیز اس کے سر کے اوپر ٹکی تھی۔ وہ درخت کو ہلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ گول گول چیز گر جائے۔ لیکن وہ چیز وہیں ٹکی تھی۔ وہ خوش ہو رہا تھا۔ یہ ہوئی نہ بات۔ وہ خوش ہو ہو کر رنگ بدل رہا تھا۔ زندگی میں کبھی اس نے اتنے رنگ نہیں بدلے تھے، جتنے آج بدلے تھے۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ تمام زندگی اس نے ان درختوں کی چھال میں پھر پھر کر گھس گھس کر گزاری تھی، کیڑوں کو ہضم کرتے ہوئے ایک جیسی، بے مزہ یا کبھی کبھی ان جلتے ہوئے بلبوں کو دیکھ کر۔ لیکن اُف کتنا مزہ آ رہا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کھٹ سے اس کے سر کے پاس کوئی سخت چیز ٹکرائی وہ سنبھل نہ سکا۔ پٹاخ سے نیچے، بچوں کے پاؤں کے پاس آ کر گرا۔ وہ بوکھلا گیا۔ بچے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اب ایک ساتھ اس پر جھکے۔ اور وہی شور جو اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن یہ شور اب اس کے سر پر ایسا لگا جیسے کسی نے بہت سے پتھر مارے ہوں۔ وہ بھاگا۔ گول دائرے میں بچے اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ کوئی چیز ایک بار پھر کھٹ سے اس پر گری۔ اور شور۔ وہ وہاں سے نکل نہیں پا رہا ہے، بچے گول گول چیز سفید چیز بھول کر اس کو نشانہ بنا چکے تھے۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ بچے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ ہانپنے لگا۔ وہ جان چکا تھا۔ بچے اس سے موت کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ کھیل ناگہانی بن گیا تھا۔ ایک بار پھر کوئی سخت چیز اس کے جسم سے ٹکرائی۔ اس کے سر سے گاڑھا گاڑھا سا خون نکلنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر زمین سے چپٹ گیا۔ ایک بار اس کا دل چاہا، جست لگا کر اوپر پتوں کو پکڑے لیکن اس کی نگاہ گول گول سفید چیز سے ٹکرائی۔ اسے لگا جیسے وہ گول گول سفید چیز اب بچوں کو اس سے کھیلتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔

سڑک پار کرنے سے پہلے

سڑک پار کرنے سے پہلے اس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ دونوں طرف دیکھا اپنے آگے پیچھے پھیلے ہوئے قدموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا۔ مجھے اب سڑک پار کرلینی چاہیے۔ اس نے سوچا۔ دونوں طرف کی ٹریفک اس کی نگاہ سے بہت دور تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔ اس کی عادت میں یہ تھا۔ ایک جیب میں ہاتھ رہتا۔ یا دونوں جیبوں میں۔ اس نے سڑک پار کرنے سے پہلے اپنے کو لبے پر جھولتے ہوئے ہاتھ کو محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ اس کی ماں اس کی اس حرکت پر اکثر ہنستی تھی جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

ایک سکینڈ میں اس نے اتنا سوچا اور دوسرا یا تیسرا قدم اٹھایا تھا کہ اس کے دائیں طرف سے ایک تیز رفتار گاڑی نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ پھر اس کی جیب میں چلا گیا۔ اسے جلدی نہیں تھی۔ ٹریفک کی مداخلت اور سڑک کا رش اسے بے چین نہیں کر رہا تھا۔ لیکن جلدی ہو بھی سکتی تھی۔ اس کی عادت تھی۔ لمحوں میں پرسکون ہو جاتا سب کچھ بھول کر اور لمحوں میں سب کچھ یاد کر کے بے چین ہو جاتا۔ بہت کام ایک ساتھ گٹھری بن کر اس کے سر پر وزن ڈال دیتے ہیں۔ اس نے چہرے کو ایک بار پھر دائیں بائیں گھمایا۔ سڑک پر اچانک ٹریفک آنے جانے لگی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے سوچا۔ آنا اور جانا سمت پر منحصر ہے۔ سڑک کے اس پار یا اس پار آنے یا جانے کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ اب کے دونوں ہاتھ جیب سے باہر تھے بے دھیان ہوتے ہوئے یہی ہوتا تھا۔ ہاتھ جیب سے باہر آ کر جھولنے لگتے، قدموں کے آگے پیچھے پڑنے کے ساتھ ساتھ ایک دائرہ بناتے جاتے اور اس خیال کے ساتھ ایک ردم ہاتھوں کے جھولنے کا بھی ہوتا۔ وہ بے دھیان ہوتا جاتا۔ اس کی ماں اکثر کہتی تھی، "دھیان سے چلا کر!" وہ آج عمر کے آدھے حصے میں تھا لیکن بے دھیان رہتا تھا۔

سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے بہت وقت گزر گیا۔ سڑک پار کرنے کا جوش ایک بار پھر اسے آگے بڑھانے لگا۔ اس نے دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ ایک قدم آگے بڑھایا۔ ایک ہاتھ پھر جیب سے نکالا۔ اور دوسرا قدم آگے بڑھایا۔ اب کی بائیں جانب سے گڑگڑاہٹ اٹھی اور پیچھے ہوتے ہوئے اس نے سوچا اس کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا۔ بے شمار ناگہانی آفات آتی رہیں۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن ہمیشہ بہت آگے جانے کے لیے بہت پیچھے ہٹنا پڑا۔ بہت پیچھے یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ مسکرایا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سڑک دونوں طرف خالی تھی۔ اس نے پھر ارادہ باندھا۔ دونوں قدم ایک دوسرے سے ملائے۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے پھر ایک ہاتھ جیب سے نکالا۔ پھر ایک جست میں وہ دوسری طرف تھا۔ دوسرے کنارے پر اس نے سوچا۔ وہ پھر بے دھیان ہو گیا تھا۔ وہ اسی کنارے تھا۔ دونوں ہاتھ اس کی جیبوں سے باہر تھے۔ اور ایک قدم دوسرے قدم سے آگے نکلا ہوا تھا۔ سامنے ایک بار پھر ٹریفک کا ریلا آ رہا تھا اور جا رہا تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا۔ جانے یہ جا رہا ہے یا آ رہا ہے یا اس کی طرح ایک ہی جگہ پر حرکت کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ ایک بار پھر جیبوں میں چلے گئے۔ ایک بار پھر دونوں قدموں کو ملا کر وہ سڑک پار کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اور اس کا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرانے کے لیے تیار تھا۔

خارش

وہ گھر کے کچھ ہی آگے نکلی تھی۔ سڑک پار کرتے ہی اس کو ایک جھرجھری سی آئی۔ دونوں کولہوں کے بیچ کی ہڈی کے پاس سرسراہٹ سی ہوئی۔ وہ چلتی رہی۔ پہلی سرسراہٹ نے ہی جھرجھری پیدا کی تھی۔ سڑک پر چلتے ہوئے اس کا ہاتھ غیرارادی طور پر کھجانے کے لیے پیچھے کی طرف ہوا۔ لیکن نہیں، وہ ہاتھ ہلا کر ہی رہ گئی۔

کیا وہ اس بھری سڑک پر اپنے کولہوں کے گھیراؤ میں چھپی ہڈی کو کھجا سکے گی۔ فاصلہ دو فرلانگ کا ہوگا جہاں اسے جانا تھا۔ اب وہ اس سڑک پر چل رہی تھی۔ جہاں زیادہ تر سناٹا ہوتا ہے۔ اکا دکا راہ گیر، ورنہ آگے پیچھے سے آنے والی گاڑیاں، اس نے آہستہ سے پلٹ کر دیکھا۔ اگر کوئی گاڑی دور ہو، یا سڑک خالی ہو، وہ ارادہ باندھ رہی تھی کہ اگر اسے موقع مل جاتا تو وہ اس حصے کو رگڑ دیتی۔ لیکن ہر بار، ایک نہ ایک گاڑی سامنے سے یا پیچھے سے گزر جاتی۔

یوں تو وہ روز یہاں سے گزرتی تھی۔ فاصلہ بھی کم لگتا تھا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی پہلے اتنی زیادہ دکھائی نہیں دی تھی۔ ایک دفعہ پھر سناٹے کا احساس ہوا۔ اور خارش کی تیزی چبھن میں بدلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ہاتھ تیزی سے پیچھے لے گئی۔ پچھلے ڈھیلی قمیض کے جھول میں اس کا ہاتھ ابھی جگہ بنا ہی رہا تھا کہ ایک راہ گیر کے قدموں کی چاپ نے اس طرح ہٹنے پر مجبور کر دیا کہ جیسے وہ قمیض کے جھول کو آگے لا رہی ہو۔

خارش کی تیزی نے اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی بکھیر دیں۔ اس کے دونوں کولہے بھی خارش کی زد میں جیسے آگئے تھے۔ اس نے قدموں کو تیز کر دیا۔ اب اس پارک کا گیٹ اس کے سامنے تھا جس میں سے وہ روز گزرتی تھی۔ پارک کے درمیان سے گزرنے سے اس کا راستہ چھوٹا ہو جاتا تھا، پارک میں کچھ لوگ دور دور بیٹھے تھے۔ مگر سب اپنی دھن میں۔ اس کو صاف نظر آ رہا تھا، کوئی اس کو گزرتے ہوئے دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس کا وہاں سے گزرنا روزمرہ کے معمول کا حصہ تھا۔ کون دیکھ رہا ہوگا اسے۔

اور اب کی اس خارش نے اس کے سارے جسم کو اچھال سا دیا۔ اس کا ہاتھ ایک دم اٹھا اور اس کے کولہوں کے درمیان ٹکا ہی تھا کہ جانے کہاں سے ایک گیند کھٹ سے اس کے پاؤں پر گری۔ وہ رک گئی دو جوان لڑکے شرمندگی سے مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرائی۔ پارک کا اب وہ کونہ آ پہنچا تھا جو اکثر خالی رہتا تھا۔ وہ اس کونے تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھی۔ دو چار قدم بعد وہ کونا آنے والا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ وہ رک کر اس خارش سے جان چھڑائے گی۔ چلتے ہوئے، کولہوں کی حرکت ہاتھ کو ہڈی تک نہیں پہنچنے دیتی تھی۔

اب وہ رک چکی تھی۔ اس کا ہاتھ پیچھے کی طرف حرکت پر آمادہ ہو رہا تھا کہ خرخراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کے بالکل سامنے چھوٹی گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں کون ہوگا، جھاڑیاں تیزی سے ہلنے لگیں۔

اسے ایک کتے کی تھوتھنی نظر آئی۔ کتا اپنی تھوتھنی پیچھے لے جانا چاہ رہا تھا۔ پیچھے اپنے کولہوں کے بیچوں بیچ۔ تھوتھنی وہاں پہنچ نہیں رہی تھی۔ خرخراہٹ کی آواز اور کتے کا گول گول گھومنا۔ کیا وہ بھی خارش کی زد میں تھا؟ تھوتھنی گول گھوم کر کولہے تک پہنچا ہی چاہ رہی تھی۔ اس نے بھی بے ساختہ منھ پیچھے موڑا اور گول گھوم گئی۔ گھومتے ہوئے اس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جنم دن

اک کیٹر پلر نے زرد پتوں میں چھپی ہوئی دنیا کو دیکھا۔ سوکھی گھاس اور زرد پتے چرمرا رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے کبھی تیز اور کبھی ہلکے، پتوں کو اڑا کر آگے کر رہے تھے۔ وہ جن شاخوں میں چھپا ہوا تھا وہ بہت زیادہ پتوں سے ڈھکی ہوئی نہیں تھیں۔ اس نے ٹوٹتی ہوئی نیند سے جمائی لیتے ہوئے دیکھا۔ کچھ پتے ابھی اس کے اردگرد باقی تھے۔ وہ پتا جس سے وہ چپکا ہوا تھا۔ وہ شاخ پر سہا ہوا ہل رہا تھا۔ ابھی زندگی باقی ہے۔ ہوا کچھ دیر تک اس پتے کا کچھ بگاڑ نہ سکے گی۔ اس نے پھر جمائی لی لیکن وہ چونک گیا۔ کسی کے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ پتوں کی چرمراہٹ بڑھ گئی تھی۔ کون ہو سکتا ہے؟ اس نے گول گول آنکھیں پیچھے کی طرف گھمائیں۔ دو پاؤں نظر آئے۔ یہ کہاں سے آ گئے؟

بہت دنوں سے یہاں کوئی انسانی صورت نظر تو نہیں آئی۔ یہ پاؤں، اس نے نگاہیں ان پر گاڑ دیں۔ وہ سوکھے پتوں کو روندتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ کیٹر پلر لرز اٹھا۔ وہ پاؤں جس جسم سے لگے ہوئے تھے اس کا سر اب ان شاخوں کی طرف تھا جس میں وہ چھپا ہوا تھا۔ شاخیں سب کی سب ننگی تھیں صرف دور دور چند پتے اور ان پتوں میں سے ایک وہ پتا جس سے وہ چپکا ہوا تھا۔ اس نے خود کو آہستہ سے دوسری طرف

سمیٹ لیا۔ یہ اس کے دشمن کی آنکھیں تھیں جو کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ وہ پاؤں دور ہوتے چلے گئے۔ اس نے سوچا اس کا جنم دن کب ہے۔ ابھی تو پورا ایک دن باقی ہے۔ ایک دن بہت ہوتا ہے۔ اس سے پہلے جو وقت اس نے گزارا وہ کیا اچھا تھا۔ آدھے دن اور آدھی راتیں کیسی لطف اندوز اور جدوجہد سے بھرپور۔ جب وہ سیانے کوؤں اور نوکیلی چونچوں والے پرندوں سے بچ بچ کر رات کی چاندنی اور دن کی بھینی بھینی خوشبوؤں کو اپنے لمبوترے چھوٹے سلنڈر نما جسم پر چھوتے ہوئے محسوس کرتا۔ یہ دنیا کتنی دلکش تھی۔ لیکن یہ وقت بھی ایسا لگتا جیسے نیچے پڑے ہوئے زرد پتوں کے اردگرد صرف دنیا اتنی ہی ہے۔ زندہ رہنے کی کشمکش اور زندگی تک پہنچنے کی مدت ابھی باقی ہے۔ اس نے لٹکے ہوئے پتے سے منہ اٹھا کر دیکھا۔ پاؤں پھر ان زرد پتوں پر گھوم رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔

آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لرز اٹھا کیا مرا جنم دن آنے سے پہلے۔ نہیں نہیں۔

اس نے نیہوڑائے ہوئے سر کو آگے بڑھا کر دیکھا۔ ہاتھ کسی دوسری شاخ پر جھول رہے تھے۔

اف بچ گیا، آخر بچ گیا۔

اس کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ دن ختم ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ سورج اب شاخوں کے اوپر ہی لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ دن اور راتیں، وہ گن گن کر گزار آیا تھا۔

وہ یہاں تنہا پہلی بار بیدار ہوا تو اس کے چاروں طرف ننھے ننھے سیاہ بھنگے اڑ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے لیے مانوس دو تین تتلیاں اپنے نرم اور شفاف پروں سے اس کو چھو چھو کر اڑ رہی تھیں۔ یہ بیداری بھی کیسی تھی۔ اسے اس بیداری کے بعد ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک اور جنم لے گا، یہ بیداری عارضی ہے۔ ایک طویل نیند کے بعد وہ دوسرا جنم لے گا لیکن یہ بیداری خوش کن تھی۔ جو آہستہ آہستہ اُسے کشمکش کے جال میں بُنتی جاتی تھی۔ ہوا، پانی اور لمبی لمبی چونچوں والے پرندے، اُسے ان سے بچنے کا فن بھی اسی

بیداری کے بعد آ چکا تھا۔ اس کی زبان کے ذائقے نے اسے پیٹ بھرنا سکھایا تھا۔

اب اس کی کل دنیا یہ پتا تھا۔ جس پر وہ بیدار ہوا تھا اور اسے وہ چاٹ رہا تھا۔ اب وہ پتا گھن کھایا ہوا میں ڈول رہا تھا، ننھی شاخ پر بہت نزاکت سے لگا ہوا، اس کا بوجھ سہارے ہوئے اسے دھوپ، ہوا اور پانی سے بچائے ہوئے اس کی کل کائنات۔

اس نے پھر جمائی لی۔ نیند اس کے لمبوترے جسم کے حصوں میں کہیں کہیں چھپی تھی اس نے نیچے کی طرف دیکھا، ہوا نے زور سے بہت سے پتوں کو اڑا کر ایک طرف کر دیا۔ ابھی اسے اپنے دشمن کا اندازہ نہیں تھا۔ کون تھا اس کا دشمن؟ لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی دشمن کسی وقت بھی اس کی گھات میں لگ سکتا ہے کون؟ کیا یہ لمبی چونچوں والے پرندے یا یہ پاؤں جو ذرا دور پتوں کو اپنی طاقت سے مسل رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر سر نہوڑا کر خود کو غنودگی کے حوالے کر دیا۔ وہ جب دشمن کے بارے میں سوچتا ایک غنودگی سی چھا جاتی۔

اس کے جنم دن میں کتنا وقت باقی ہے۔ اس نے غنودگی کی حالت میں سوچا پھر کیا ہوگا۔ یہ کائنات جس پر وہ بیدار ہوا ہے کیسی ہو جائے گی۔ اس کے بدلنے کے بعد کیا یہ سب کچھ ایسا ہی رہے گا؟ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اپنی اس حالت پر ناز کرے یا وہ جو اس کو آئندہ گردش میں لے گی۔ یا ان دونوں حالتوں کے درمیان وہ وقفہ جس کے بعد وہ اپنے جنم دن میں داخل ہوگا۔ اس کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔ سوراخ دار پتا انتہائی نزاکت سے اس کے بوجھ سے الگ ہونے لگا۔ وہ زور سے چمٹ گیا۔ نہیں، نہیں، ابھی میرے جنم دن میں بہت وقت باقی ہے۔

پتا چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کی زبان کے ذائقے نے ہی اسے اس حالت میں پہنچا دیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ نیچے ایک بار پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور شاخیں زور زور سے ہلنے لگیں۔ جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ تیز اور تیز، پتا جس شاخ سے جڑا ہوا تھا وہ ٹوٹ کر لٹک گئی۔ کیٹر پلر زمین اور ہوا میں یوں معلق تھا کہ اگر گرتا تو پاؤں تلے آ جاتا۔ پتا روئیں کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پھر سب خود بخود سنبھل گیا۔ چاروں طرف سکوت طاری ہو گیا۔ یہ

سارا وقت بڑی اذیت ناک حالت میں گزرا تھا۔ لمحہ لمحہ اس کا سارا جسم روئیں کی طرح لرزتے ہوئے پتے سے خود کو چمٹائے ہوئے اور ٹوٹی شاخ کو جھولتے ہوئے دیکھتے ہوئے۔ اب اس پتے کی حالت یہ نہیں تھی کہ وہ لمبی چونچوں والے پرندوں سے بچنے کے لیے خود کو ادھر سے ادھر سمیٹ لیتا۔ بس سہما ہوا، ایک سمت کو چمٹا ہوا۔ سر اٹھانے اور نہوڑانے کی بھی ہمت نہ تھی۔ نہ جانے کب یہ تار ٹوٹ جائے۔ اور کب وہ اپنے جنم دن تک پہنچنے سے پہلے ہی.....

اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ بس ٹھیک ہے۔ اب شاید بہت تھوڑا وقت باقی ہے۔ بس کچھ لمحوں کے بعد وہ اپنے جنم دن میں چھلانگ لگائے گا اور پھر کیا ہوگا؟ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ جنم دن اسے کیا نام دے گا۔ وہ کس نام سے پکارا جائے گا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، ہوا سست رفتار تھی۔ اس کی آنکھیں غنودگی سے ڈوبنے لگیں۔ لیکن کب اس کی آنکھ کھلی، کب اس نے جمائی لی اور کب وہ پتا ہوا میں ڈول گیا۔ یہ جمائی شاید زور سے لی تھی۔ پتا شاخ سے ٹوٹ چکا تھا، ہوا میں پھر پھراتا ہوا اس کا بوجھ نہ سہار سکا۔ اور زمین پر آ رہا، زمین پر دو پاؤں آگے بڑھے اور پتے کو کچلتے ہوئے نکل گئے۔ کیٹر پلر نے پلٹا کھایا۔ ایک آواز آئی۔ کیا تھا؟ کسی نے سر جھکا کر دیکھا۔ ایک مضمحل پرندہ اڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن افسوس، کیٹر پلر اپنے جنم دن پر کہاں تھا؟

خوشبو

اسے پتا نہیں تھا۔ یہ خوشبو اس کا پیچھا کر رہی تھی یا وہ اس خوشبو کا، لیکن بہت عرصہ سے یہ کھیل جاری تھا۔ بہت عرصہ بیت گیا تھا جب وہ دبے پاؤں سویرے سویرے اٹھ جاتی اور ان ہی دبے پاؤں چلتی ہوئی باہر نکل جاتی۔ اس کی ناک خوشبو کی سمت اس کو کھینچتی لیے جاتی اور وہ ایک دو تین چار کوارٹروں کو چھوڑتی ہوئی اُس کوارٹر کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ خوشبو اب سیدھی اس کی ناک سے حلق میں اترنے لگتی۔ وہ کافی دیر تک کوارٹر کے دروازے کی جھری سے آنکھ گڑوئے ہوئے اپنی پتلی سارے کمرے میں گھماتی۔ اس جھری کی حدود میں جتنا حصہ نظر آتا وہ بڑی دیر تک اس کے سحر میں کھوئی رہتی۔ پھر وہ آہستہ سے دھپ دھپاتی۔ آجاؤ، وہ دروازہ کھول کر دبے پاؤں اندر چلی جاتی۔ سحر زدہ نگاہوں سے اس جانب دیکھتی ہوئی جہاں سے خوشبو امڈ رہی تھی۔ مسکراتی ہوئی نگاہیں اس کا خیر مقدم کرتیں۔ وہ اپنی نگاہوں ہی سے جواب دیتی۔ اس کے ہونٹ جس طرح سوتے ہوئے نیند میں بند تھے ویسے ہی اک دوسرے سے چپکے ہوئے ہوتے۔

اس چھوٹے سے کمرے میں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی دیواریں اور چھت اور بستر۔ اور یہ عورت، سنہرے روپہلے رنگوں میں لپٹا ہوا یہ کمرہ، اسے خواب سا نظر آتا۔ ایک سحر پھیلا

ہوتا۔ اور چاروں طرف ایک عجیب خوشبو جس کے بھبکے، اس کی ناک، اس کے حلق اور اس کے پیٹ میں بھرے جا رہے تھے۔ وہ ساکت بیٹھی رہتی۔ وہ عورت اس کے سامنے عجب انداز سے سنہرے سنہرے رنگ برنگے کپڑوں میں گھومتی رہتی۔ کبھی آئینے کے سامنے، کبھی بستر پر، یہ عورت اسے اچھی لگتی۔ یہ کون تھی؟ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عمر کے وہ جس حصے میں تھی، وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ ماں اور پھوپھی کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس عورت سے صرف خوشبو کا رشتہ تھا، جو روز صبح اسے بستر سے اٹھا کر سیدھا یہاں کھینچ لاتا۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگتا، ان خوابوں جیسا، جو وہ روز اپنی آنکھوں میں رات کو سوتے ہوئے بھر لیتی تھی۔

وہ اپنا صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا سب بھول کر یہاں بیٹھی رہتی۔ اسے لگتا سب کام غیر ضروری ہیں۔ اس خوشبو کے سامنے ہر چیز بے کار ہے۔ باقی تمام چیزوں سے بے خبر۔ اپنے ماں باپ بہن بھائی، سب سے بے خبر۔ صبح سے دوپہر تک اس کی واپسی اپنے گھر کی طرف کیسے ہوتی، کیوں کر وہ اس خوشبو سے علیحدہ ہو کر گھر جاتی۔ اسے کچھ خبر نہ ہوتی۔ شاید گھر واپس ہونا ضروری ہوتا تھا۔

واپسی میں اس کے گھر والے اس سے باز پرس کرتے۔ کہاں گئی تھی، ننگے پیر، منہ دھوئے بغیر، کھائے پیے بغیر؟ ماں سر پر ہاتھ رکھے روہانسی ہوئی اسے دیکھتی، باپ کی غصہ ور آواز اس کے گرد گھومتی، بھائی بہن اس کی فراک گھسیٹ کر اس سے پوچھتے، وہ چپ چاپ کھڑی رہتی۔ پھر ہر روز کی طرح آوازوں کے شور میں وہ کچھ دیر کے لیے خوشبو کی آمد ورفت بھلا بیٹھتی۔ دن کا باقی حصہ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لڑتے ہوئے، ہنستے ہوئے گزارتی۔

لیکن دوسری صبح پھر وہی ہوتا، آنکھ کھلتے ہی خوشبو کی آمد سے اس کی ناک بھر جاتی۔ اس کا حلق تر ہونے لگتا۔ اور پھر سینے سے پیٹ تک وہ گھبرا کر اٹھ جاتی۔ اس کی ماں ابھی چولہا گرم کر رہی ہوتی۔ باپ اخبار پر آنکھیں بچھائے ہوتا۔ کون کیا کر رہا ہوتا اور کیا نہیں۔ وہ ایک نگاہ سب پر ڈالتی، کبھی کبھی کچھ بھی نہیں دیکھتی اور دبے پاؤں چل

نکلتی۔ وہی دروازہ، وہی چھری، وہی تشت، وہی عورت اور خوشبوؤں کا ریلا، چاروں طرف سنہری، روپہلی پنیاں، جھلمل جھلمل کرتی اور جھلمل جھلمل کرتے یہ رنگ۔

پتا نہیں کب تک یہ کھیل جاری رہا اور کب اور کیسے اس کا اور اس خوشبو کا ساتھ چھٹا۔ لیکن پھر سارے وقت اس کو یہ خوشبو نہ ملی۔ نہ وہ کوارٹر تھا، نہ وہ جھلمل جھلمل کرتے رنگ، ہر چیز بدل گئی تھی۔ کوئی دوسری جگہ، کوئی دوسرا گھر تھا لیکن وہ خوشبو بہت دنوں تک اس کی ناک، اس کے حلق اور اس کے سینے میں بھری رہی۔ دنوں کی رفتار کے ساتھ بہت زمانہ گزارتے ہوئے، بہت آگے بڑھتے ہوئے کبھی راتوں میں پچھلے پہر یا بہت خنک صبح کو یہ خوشبو اکثر اسے جگا دیتی تھی، اور ایک نقطہ بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی یا شاید وہ خود اس خوشبو کو اس نقطہ میں تبدیل کر دیتی۔ وہ نقطہ پھر اس کی آنکھوں سے دور ہونے لگتا۔ آہستہ آہستہ وہ اس نقطے کے پیچھے چل نکلتی۔ نقطہ چلتا رہتا۔ وہ چلتی رہتی۔ کسی تالاب کے سامنے، کسی درخت کے نیچے، کسی میدان میں گم صم، دن کی روشنی میں تو وہ باہر آ جاتی تھی، لیکن رات کے اندھیرے میں جب سارے دروازے کھڑکیاں بند ہوتی تھیں۔ سب سوئے ہوتے تو یہ نقطہ پھیل جاتا تھا اور اسے سیاہ چادر میں ڈھانپ لیتا۔ وہ پریشان سی ہو جاتی۔ کوئی اس کی حالت سے واقف نہ تھا۔

اس سارے وقتوں میں زندگی گزرتے ہوئے، بہت سے ڈھب کے ساتھ، اپنی ماں سے، بہنوں سے، رشتہ دار عورتوں سے، اپنی ہم عمر ساتھیوں سے، بہت کچھ سیکھتے ہوئے اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا، لیکن وہ خوشبو کہیں نہیں تھی، سوائے ایک یاد، ایک خیال کے ساتھ، وہ رنگ جو اس کی آنکھوں میں کھب گئے تھے، وہ خوشبو جو اس کی ناک میں دھنسی ہوئی تھی۔ اور ایک نقطہ بن جاتی تھی۔ وقت کی رفتار بڑھتی گئی، بڑھتی رہی۔ شادیوں، میں جاتے ہوئے، بہت سی عورتوں کو سجے ہوئے، خوشبوؤں میں بسے ہوئے دیکھتی رہی، لیکن وہ خوشبو کہیں نہیں تھی، جو اس کا پیچھا کرتی تھی، یا وہ اس کا پیچھا کرتی تھی۔ اندھیروں میں ملگجی روشنیوں میں چمکدار صبحوں اور تپتی دوپہروں میں کہیں نہیں، کبھی نہیں۔ اگرچہ وقت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ وہ بہت کچھ جان گئی تھی، اندھیرے

اور اجالے میں زندگی کی تبدیل ہوتی ہوئی آمد و رفت میں سب کچھ جاننے کے بعد بھی۔ کبھی کبھی وہ خوشبو اور وہ نقطہ اس کے سامنے آ جاتا لیکن اب وہ اس کی نگاہوں کے سامنے گردش کرتا اور پھر اس کی پتلیوں میں تحلیل ہو جاتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے ان لمحوں میں اندھی ہو گئی ہو۔

اور ایک دن جب اس کے ہاتھوں کو بھی سنہری پنیوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کے جسم کو بہت سے رنگوں سے لپیٹا گیا تھا۔ اس نے بے انتہا شور میں سر اٹھا کر دیکھا، ویسی ہی چھت، ویسی ہی دیواریں، ویسے ہی جھلمل جھلمل کرتا ہوا کمرہ، سب کچھ اسی طرح تھا، کچھ فرق نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں رنگ جھلملا رہے تھے۔ بہت دور، کچھ یاد کرتے ہوئے اس کے سامنے وہ کوارٹر تھا۔ سب شاید ویسا ہی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو گھوم گھوم کر دیکھا۔ لیکن خوشبو، اس نے زور زور سے سانسیں لیں۔ بہت سی خوشبوئیں تھیں۔ نئی نئی لیکن ایک سحر زدہ خوشبو نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بجھنے لگیں، جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔

ایک صبح وہ ان رنگوں میں گھری کھڑی تھی۔ اس کے دروازے کو کسی نے دھپ دھپایا۔ آ جاؤ۔ اس نے مسکرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہ ننھی سی فراک سمیٹے دروازے سے لگی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تم کیوں آئی ہو، کیا کوئی خوشبو تمہیں یہاں لائی ہے، بولو، بچی سحر زدہ آنکھوں سے اسے گھورتی رہی، تمہاری ناک، تمہارے حلق، تمہارے پیٹ میں، کوئی خوشبو بھری ہوئی ہے، تمہیں کوئی خوشبو کھینچ لائی ہے۔ وہ لڑکی جھلمل جھلمل کرتی پنیوں کو سحر زدہ آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ ہونٹ بھینچے ہوئے۔ جیسے نیند میں سوئے ہونٹ ایسے ہی اٹھلائی ہو۔ کھلی ہوئی حیران آنکھوں سے۔ وہ زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ نہیں۔ نہیں یہاں تو وہ خوشبو نہیں ہے۔ تم کیوں آئی ہو۔ کیا کوئی خوشبو تمہیں یہاں لائی ہے؟

وہ حیرت، خوف اور دکھ سے اس بچی کو دیکھتے ہوئے پوچھے جا رہی تھی جو حیرت زدہ آنکھوں سے جھلمل جھلمل کرتے ہوئے رنگوں کو اپنی پتلیوں میں سجائے اسے گھور رہی تھی۔

آنکھیں

مجھے یہ لگا جیسے وہ مجھے اس موڑ پر ضرور ملے گا۔ میں نے اس لمبی سڑک سے گزرنا شروع کر دیا۔ مجھے حیرت ہوئی میں اس طرح کیوں سوچ رہا ہوں، میرے قدم وہاں کیوں مڑ گئے ہیں۔ میں کیوں اس راستے پر چلا جا رہا ہوں۔ جبکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے اب کبھی وہاں نہیں ملے گا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی تصدیق میں نے آس پاس کے لوگوں سے کی تھی۔ جب ایک دن اچانک وہ مجھے وہاں نظر نہیں آیا تھا۔ اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ اس کے باوجود میرے قدم تیز رفتاری سے وہ فاصلہ طے کر رہے تھے۔ جب وہ زندہ تھا تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اس تعلق کی وضاحت بھی نہیں کر سکتا جو میرا اس سے قائم ہوا تھا۔ بس اتنا کہ ایک چہرہ بار بار دیکھنے کے بعد مانوس لگتا ہے اور جب نہ دیکھنے کے باوجود دکھائی دینے لگے اس لیے کہ آنکھوں کو پھر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ محسوس کرتی ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ کام سے واپسی کے دوران مجھے اس سڑک کے موڑ پر وہ کونے کی دکان کے پاس ایک چبوترے پر دیوار کے سہارے کھڑا ملتا۔ وہ شاید کسی کا منتظر ہوتا۔ یوں لگتا جیسے وہ کسی کو لینے آیا ہو۔ مجھے اس تمام عرصے میں نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس کو لینے آتا تھا یا کیوں آتا تھا۔ بس گزرتے

ہوئے اس کی طرف منہ موڑ کر میں بلا ارادہ ضرور دیکھ لیتا۔ وہ ہوتا۔ ضرور ہوتا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ میں اسے دیکھے بغیر وہاں سے گزر گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں مجھے اپنی پیٹھ پر چپکی ہوئی محسوس ہوئیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ مجھے اس سے کوئی بھی موقع ملاقات کرنے کا نہیں ملا۔ لیکن اس کی موجودگی میری ضرورت بنتی چلی گئی۔ بلا وجہ، غیر ارادی طور پر یہ سب کچھ جاری رہا۔ بہت عرصے تک یوں ہی جیسے اسے جاری رہنا چاہیے تھا۔ کبھی ختم نہ ہونے کے لیے۔

لیکن ایک دن جب میں وہاں سے گزر کر گھر پہنچا تو وہ آنکھیں میری پیٹھ سے چپکی ہوئی نہیں تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ حیرت ہوئی کہ ایسا کیوں ہے؟ میں دوسرے دن کا انتظار بے چینی سے کرنے لگا۔ میں نے دوسرا دن اس وقت تک بہت انتظار اور اضطراب سے گزارا۔ کیا میں روزمرّہ کے معمولات سے لاتعلق ہو گیا ہوں یا وہ وہاں نہیں تھا۔ میرے اندر خوف اور بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس دن میں دفتر سے نکلا۔ میں نے اسی رفتار سے سڑک عبور کی۔ وقت کا تعین مجھے تھا۔ وہ وہاں ہوگا۔ میں خود ہی اپنے سوالوں کے جواب دیتا ہوا اس سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شاید وقت آگے پیچھے ہو گیا ہو، میں صحیح وقت پر نہیں آیا ہوں۔ میں نے دیر تک وہیں اس کا انتظار کیا۔ لیکن رات ہو گئی مجھے لگا جیسے وہ علاقہ وقت سے خالی ہو گیا ہو۔ وہ رات میں نے مایوس کن گزاری۔ میں حیرت اور ملال میں تھا۔ میں روز گزرتا رہا۔ روز اس کا وجود تلاش کرتا رہا۔ میری پیٹھ میں وہاں سے گزرتے ہوئے ایک سرد لہر دوڑ جاتی تھی۔ لیکن وہ مجھے اس کے بعد پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہاں اب نہیں ہوگا۔ پتا نہیں کب میں اس ملال سے نکلا اور کب میں نے اس سڑک کو عبور کرکے وہاں سے گزرنا چھوڑا۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا۔ برسوں گزر گئے لیکن اچانک پھر ایک دن یہ احساس ہوا کہ وہ وہاں ہوگا۔ میں نے اپنا راستہ بدل لیا۔ میں اسی سڑک پر چل پڑا۔ اسی وقت اس موڑ پر پہنچا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ وہاں ہوگا، میں نے ارادتاً مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ میں وہاں سے گزرتا چلا گیا۔ اس چہرے کو دیکھے بغیر۔ اسی لاپروائی سے جو اس کے وہاں

رہنے پر مجھ پر رہتی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ آنکھیں میری پیٹھ پر چپکی ہوئی تھیں۔ میری پیٹھ پر سرد لہر نہیں دوڑی تھی بلکہ دو گرم گرم آنکھیں چپکی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد میں اس سڑک سے کبھی نہیں گزرا لیکن میرے اندر ملال ختم ہو چکا تھا۔ مجھے وہاں سے گزرے بغیر یقین ہے کہ وہ وہاں کھڑا ہوگا۔ اسی وقت میں اسی جگہ اور کوئی گزرنے والا اسے دیکھ رہا ہوگا اور اس کی آنکھیں اس کی پیٹھ پر رینگ رہی ہوں گی۔

باپ

اس کو اپنے باپ سے محبت تھی۔ اس کو ہمیشہ اپنی انگلی میں اس کے ہاتھ کا گرم گرم لمس محسوس ہوتا، جب وہ اپنے باپ کو یاد کرتا تھا، جب وہ اسے اسکول لے جاتے ہوئے اس کی انگلی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوتا، اور وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے لڑھکتا ہوا اس کے ساتھ چلتا۔

اس کا باپ چلتے ہوئے، ہمیشہ تھوڑی دیر کے بعد اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، جیسے اسے چھیڑ رہا ہو۔ اور وہ مسکرا کر اپنے باپ کو دیکھتا۔ اس کا باپ اس کی مسکراہٹ کو دیکھنے کے لیے ہی ایسا اکثر کرتا تھا۔

یہ سلسلہ جاری تھا، لیکن ایک دن اس کی ماں نے شام کو اسے گھسیٹ گھساٹ کر تیار کیا۔ اور اس کے کپڑوں اور بستے سمیت اسے باپ سے دور لے گئی۔

اب اسے کوئی اور اسکول پہنچاتا تھا۔ جس گھر میں اب اس کی ماں گئی تھی وہ، اس کی ماں کا گھر تھا۔ جس میں اس کی ماں کے بھائی، بڑی مستعدی سے اس کی ماں کی خدمت کرنے پر تل گئے تھے۔ وہ اس کے آگے پیچھے بھی بچھے رہتے۔

بالکل اس طرح جیسے وہ اس کے غم کو بھلانا چاہ رہے ہوں جو اسے اپنے گھر کو

چھوڑنے پر ہوا ہوگا۔ لیکن وہ اکثر اپنے جملوں میں ایک ایسی یکسانیت رکھتے جیسے وہ اس کی ماں پر رحم کھا رہے ہوں۔ اور اس کی ماں کے چہرے پر غم کم اور غصہ زیادہ نظر آتا۔ اس کی سمجھ میں اس وقت کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اب اپنی ماں کی ماں کے گھر میں ہے اور اس کی انگلی اپنے باپ کے گرم گرم ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے۔

اب وہ اسی گھر میں رہ رہا تھا۔ اور اس گھر میں اکثر وہ شخص اس کی ماں سے ملنے آتا تھا جو اس کے دھیان میں اس طرح رہ گیا تھا کہ شاید وہ اس کی ماں کا دوست تھا۔ اور جب وہ اس کے باپ کے گھر آتا تھا اس دن وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ماں کا چہرہ دمک رہا ہوتا تھا۔ لیکن اس کا باپ افسردہ رہتا تھا بلکہ اس کے جانے کے بعد وہ اکثر زور زور سے بولتا ہوا نظر آتا۔ ایسے سے اس کی ماں اسے وہاں سے دور کر دیتی۔ یا خود وہ کسی کمرے میں دبک جاتا اس لئے کہ وہ خود نہیں چاہتا تھا کہ اپنے باپ کی محبت سے لبریز مسکراتی آنکھوں کے سوا کچھ اور اس کے چہرے پر دیکھے۔

اپنی ماں کی ماں کے ہاں وہ بڑا ہو رہا تھا۔ لیکن اس کا باپ اکثر اس گھر کی چوکھٹ پر آ کھڑا ہو جاتا۔ اور وہ کسی گھر والے کے اشارے سے باہر اپنے باپ سے ملنے چلا جاتا جہاں اس کا باپ اب ان ہی محبت سے لبریز آنکھوں میں افسردگی سے لپٹی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ملتا۔ پھر وہ اس کی انگلی اسی طرح تھام کر اسے دیر تک گھماتا اور اپنی اسی حرکت کو بار بار دہراتا جس سے وہ خوش ہو کر باپ کی طرف دیکھتا جاتا اور باپ اس کی طرف۔

لیکن پھر یہ دیر تک نہیں رہا۔ اس کی ماں اسے بہت دور لے گئی۔ اس دن اس کا باپ رات گئے تک اس کی ماں سے گڑ گڑا، گڑ گڑا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن اس کی ماں، بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ، سر اس طرح ہلا رہی تھی جیسے وہ اپنے بالوں پر پڑی ہوئی کوئی چیز جھٹک کر پھینک رہی ہو۔ اور پھر آخری بار اس رات اس کے باپ نے اسے گود میں لے کر خوب بھینچا اتنا کہ اسے بھی اپنے باپ کی وہ محبت جو اس کے سینے میں بھری ہوئی تھی اسے اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔

پھر ایک عرصہ وہ ملک سے باہر دور دراز علاقے میں ماں کے ساتھ رہتا رہا۔ ماں جو سارا دن مصروف رہتی۔ یہاں تک کہ اسے ایک ایسی جگہ اس نے شفٹ کر دیا جہاں وہ ہفتہ بھر بعد اس سے آ کر ملتی۔ اس کو اپنی ماں کی آنکھوں میں کبھی وہ بات نظر نہیں آئی جو وہ باپ کی آنکھوں میں دیکھتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ صرف ماں کے جسم سے سٹ کر سونا چاہتا رہا لیکن وہ اپنی مصروفیت کی مجبوری سے اسے اپنے سے دور کرتی چلی گئی۔ اس نے کبھی نہیں جانا کہ ماں اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی۔ جب وہ اپنے کمرے میں تنہا لیٹا ہوتا تو اسے ماں کبھی یاد نہیں آتی، بس باپ کی مٹھی کی گرمی۔ وہ دیر تک اپنی انگلی اپنے ہونٹوں سے لگائے پڑا رہتا۔ اب اس کا اپنے باپ سے کوئی واسطہ بھی نہیں رہا تھا۔ سوائے باپ کی یاد کے۔

وقت بہت سا گزر گیا تھا۔ وہ بڑی کلاس میں تھا۔ ماں بھی، اپنے بہت سے کاموں سے نبٹ گئی تھی۔ وہ پھر واپس جا رہی تھی۔ وہاں جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ اس دن وہ خوش تھا اور دیر تک اپنی انگلی کو چومتا رہا تھا۔

اپنے ملک پہنچ کر، اس کی ماں نے پھر ایک بار اپنی ماں کے گھر میں ڈیرا ڈالا تھا۔ اور وہ اب مجبور نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی کہیں آنے جانے میں مدد کرے۔ اب وہ خود آتا جاتا۔ یہاں وہی سب کچھ تھا سوائے اس کے کہ وہ ابھی تک اس منظر سے محروم تھا جس میں اس کا باپ چوکھٹ پر آ کر اس سے ملتا۔ پھر ایک دن وہ خود اپنے باپ سے ملنے چلا گیا۔ اس کا باپ گھر کے صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا دیوار گھور رہا تھا اور اتنا کمزور نظر آ رہا تھا جیسے بہت بیمار رہا ہو۔ وہ پہلے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھتا رہا۔ لیکن اس کا باپ اس سے بھی زیادہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہ انگلی جو ہمیشہ باپ کی طرف تھامنے کے لیے بڑھاتا تھا، بڑھائی، لیکن اس کا باپ اس کی اس انگلی کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ انگلی نہ ہو، بلکہ اس کو مارنے کا کوئی آلہ ہو۔ وہ خود کو اس طرح ڈر کر بچا رہا تھا جیسے اس کا دشمن اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ بے بس ہو۔

وہ دوڑ کر اپنے باپ کے پاؤں سے لپٹ گیا تھا، وہ رو رہا تھا۔ اس کو اپنا وہ وجیہ

باپ یاد آ رہا تھا جو ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں، ایک اچھی سی خوشبو لگائے رہتا، جس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ رہتی۔ لیکن اس وقت وہ جس شخص سے لپٹا ہوا تھا وہ انتہائی میلا کچیلا، اپنے آپ سے شرمندہ، اور خوف زدہ سا تھا۔ وہ باپ سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ اس کا بیٹا ہے جس کی انگلی تھام کر وہ اسے گھماتا تھا۔ لیکن وہ ان جان، خوفزدہ اور شرمندہ تھا۔ وہ دیر تک گم سم باپ کے پاس بیٹھا رہا۔ اب وہ خود اٹھارہ انیس سال کا جوان لڑکا تھا۔ اور اس کا باپ جو اپنی گئی جوانی میں بوڑھا اور نحیف نظر آ رہا تھا اس کو پہچان نہیں رہا تھا۔

اس کی ماں آج بھی جوان تھی اور اپنے چہرے پر بہت سے رنگ سجائے ہوئے تھی۔ اس کا دل اس کو دیکھ کر کبھی خوش بھی ہوتا۔ ایک بدرنگ اور بے مزہ زندگی میں اپنے گھر کے تصور کے بغیر رہتے ہوئے ماں کے بے ملال چہرے پر ہمیشہ تازگی رہتی جب کہ وہ خود اب باپ کو اس حالت میں دیکھنے کے بعد جیسے بوڑھا سا ہو رہا تھا اور پھر ایک دن اس نے سنا اس کا باپ مر گیا۔ اس کا دل جو ایک موہوم امید میں کبھی کبھی دھڑکتا تھا کہ ایک بار، شاید ایک بار، کسی دن اس کا باپ اس کی انگلی پکڑے گا، اب امید ایک خلا میں ڈول گئی تھی۔

باپ کی موت کے بعد اس نے دیکھا ماں کے چہرے پر کوئی افسردگی نہیں تھی۔ بلکہ کسی رہائی سے جیسے اس کا چہرہ اور مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب اور چمکنے لگی تھیں۔ لیکن اچانک ان آنکھوں میں ایک عجیب کیفیت وہ اپنے لیے ڈھونڈ لیتا تھا۔ وہ بھی کبھی اسے شفقت سے دیکھتی نظر آتیں۔ اس کی آنکھوں کے اس انداز نے اس کے دل کو کچل ڈالا۔ وہ اپنے باپ کو یاد کرتا ایک ایسے بچے کی طرح جو ابھی ابھی باپ کی انگلی چھڑا کر بھٹک جائے اور پھر باپ کو ڈھونڈنے لگے۔

لیکن ماں کی تبدیلیاں اسے اس کشمکش کے درمیان بہت عجیب نظر آنے لگی تھیں۔ وہ اب اپنی ماں کا گھر چھوڑ کر ایک نئے گھر میں چلی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ مل کر گھر کو سجا رہی تھی۔ نیا گھر اس نے نک سک سے نئی نئی چیزوں سے آراستہ کیا تھا۔ وہ

ماں کی اس تبدیلی میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن الجھنیں، اون کے الجھے ہوئے گچھوں کی طرح اس کے اندر بڑھ رہی تھیں۔ وہ ماں سے وہ سوال نہیں پوچھ رہا تھا جو اس کے دماغ میں ہیولوں کی طرح اٹھ رہے تھے۔ ماں اس کے حالات کو جانے بغیر اپنے گھر کو سجا رہی تھی۔ ایک دن وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی، ''تمہیں اپنا گھر کیسا لگا؟'' اپنا گھر؟ اس نے دل ہی دل میں اس سوال کو اپنے لیے دہرایا۔ یہ ایک انوکھا اور نیا تجربہ تھا۔ اس کے لیے اس کا اپنا گھر جس میں صرف وہ اور اس کی ماں ہوں گے، ایسا تو اس نے سوچا نہیں تھا۔ ایک ننھی سی خوشی پہلی بار ماں کے اس سوال سے اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ میں اور ماں، اب اس گھر میں رہیں گے۔ وہ اس ملال میں بھی نہیں رہا کہ اس کا باپ اس کے ساتھ اس گھر میں اب کبھی نہیں ہوگا۔ ماں کی ماں کے گھر میں رہتے رہتے وہ اپنے گھر کے تصور سے بھی نکل گیا تھا۔

لیکن ایک دن پھر اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی اس سے ایک نیا سوال کر رہی تھی۔ اور وہ سوال اس کے لیے بہت نیا ہی نہیں تھا بلکہ اسے اچنبھے میں ڈال رہا تھا۔ ''میں اکیلی ہو گئی ہوں۔ جب تم دیر سے گھر آتے ہو۔ مجھے ڈر لگتا ہے''۔ وہ ماں کے مبہم سوالوں کو غور سے سن بھی رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ماں تو ہمیشہ اکیلی رہی ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ اور پھر یہ لفظ اس نے اسی وقت اپنے منہ سے نکالا، جب اس کی ماں کہہ رہی تھی، ''اور پھر، اتنی بڑی زندگی میں آگے کیسے گزاروں''۔ اب وہ چھوٹا بچہ نہیں تھا، اٹھارہ انیس سال کا جوان تھا۔ بہت سے سال اس نے ہوش وحواس میں سوچتے ہوئے گزارے تھے۔ ماں کے اندیشوں سے بھرے سوال، جس کا جواب وہ خود ہی دے رہی تھی۔ آگے وہ بہت کچھ کہتی رہی۔ اور وہ بہت کچھ نہیں سنتے ہوئے صرف ماں کی آنکھوں میں ایک بار پھر شفقت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اب ایک نئی زندگی کی شروعات کے رنگ جھلملا رہے تھے۔

اس بار وہ دیر تک گھر سے باہر رہا۔ صبح گھر سے نکلتے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا، رات میں تمہیں، تمہارے قادر سے ملواؤں گی۔ وہ ایک لمحہ سکتے میں آنے کے بعد ماں

کے چہرے کو دیکھے بغیر باہر نکل گیا تھا اور دیر تک سڑکیں ناپتا رہا۔ گلیوں، ریستورانوں میں دیر تک پھرتا رہا۔ وہ آج اپنے انسٹی ٹیوٹ بھی نہیں جا سکا۔ کہیں کوئی اس کے چہرے کو پڑھ نہ لے۔ واہی تباہی پھرتے پھرتے، آخر وہ اس گھر کے دروازے پر پہنچ گیا تھا جو اس کی ماں نے اس کے اور اپنے لیے سجایا تھا۔ دروازہ اس نے کھولا تھا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی زمین گھورتی آنکھوں کو اٹھا کر اس چہرے کی طرف دیکھا تھی جس کو اس کی ماں نے اس کے باپ ہونے کا مستحق قرار دیا تھا۔ اس کی یادداشت سے جہاں اپنی انگلی میں باپ کی مٹھی کی گرمی نہیں نکلی تھی، وہاں یہ چہرہ بھی پرانی تصویروں کی طرح پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک سناک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ وہ کچھ کہے بغیر جگہ بناتا ہوا اپنے کمرے میں خود کو گھسیٹتا ہوا چلا گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر بیٹھا رہا۔ ماں ہمیشہ کی طرح جیسے اس کے آنے کے بعد اس کے کمرے میں دستک دیتی تھی، آج بھی آئے گی۔ لیکن وہ رات بھر جاگتا رہا۔ ماں اس کے کمرے میں نہیں آئی۔

صبح وہ دیر تک سوتا رہا۔ گھر کی نوکرانی نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ زیادہ جانتی ہو۔ نوکرانی نے اس کی نظروں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ "صاحب دفتر گئے۔ بی بی بھی کام پر گئیں۔ آپ کا ناشتہ لگا دیا ہے"۔ وہ ایک بار پھر اسی تکلیف سے گزر رہا تھا جیسا باپ کو آخری بار انگلی پکڑاتے ہوئے گزرا تھا۔ جو شرمسار اور نیم دیوانگی کی حالت میں نظر آ رہا تھا۔ اور اسے پہچاننے سے انکار کر رہا تھا۔

آج وہ بے بس، ماں کی خوشیوں کے بیچ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا باپ ہمیشہ اس سے فاصلے پر رہتا۔ صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک، ان کی ملاقات نہیں ہوتی۔ اب ماں اپنی خوشیوں کے درمیان سے نکل کر کبھی کبھی اس کا سامنا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر اس کی زندگی کی تبدیلیوں نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ اس کو ماں کو ڈھونڈنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اب وہ گھر جو ماں نے اس کے ساتھ مل کر سجایا تھا، ایک بار پھر اس کا نہیں تھا۔

ماں کو ڈھونڈنے کی آنکھ مچولی نے اسے تھکا دیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے اور ماں کی تلاش سے بچنے کے لیے وہ اس زمین کو چھوڑ رہا تھا۔ جہاں اس نے اپنی انگلی سے باپ کی مٹھی کی گرمی کھوئی تھی اور ماں کے چہرے سے......

آج بہت دور دراز علاقے میں، اپنی ماں کے گھر سے بہت دور ایک کمرے میں تنہا لیٹا، وہ ان دنوں کو یاد کر کے مسکرا رہا ہے۔ جب اس کی ماں اسے اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی ہے اور اس کا باپ اس کی انگلی اپنی محبت کی حرارت سے لبریز مٹھی میں تھامے اس کے ساتھ ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں کو چھیڑتا ہوا، مسکراتا ہوا، چل رہا ہے۔ وہ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔

محبت کی آخری خبر

کسی ایک تاریخ کی یہ کہانی ہے۔ لیکن آج کی تاریخ کی خبر ہے۔ ایک عورت نے آٹھویں منزل سے گر کر خودکشی کر لی۔ مختلف بیانات کی روشنی میں کوئی کہتا ہے اسے اس کے شوہر نے اوپر سے دھکا دے دیا۔ کوئی کہتا ہے وہ نیند کی گولیاں لیتی تھی۔ نیند میں کھڑکی کھولتے ہوئے گر گئی۔ ماتم گساروں میں بیٹھی ہوئی ماں کہتی ہے، ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا، میری بیٹی خوبصورت تو تھی، اس کے ہاتھ بھی بہت خوبصورت تھے۔ پھر وہ کیوں مر گئی۔

چشم دید گواہوں میں صرف اس کی ماں، اس کا شوہر اور اس کا تین سالہ بیٹا تھا۔ ماں کو رونے کی ممانعت نہیں تھی لیکن رونے کے دوران بین کرنے سے منع کیا جا تا رہا تھا۔ کون جانے کب وہ ہذیان بکنے لگے اور بیانات کی روشنی میں لفظ واضح ہو جائیں۔ باقی اردگرد کے لوگوں نے مصلحت کوشی سے کام لیتے ہوئے سوچا، مرنے والی تو چلی گئی۔ اب ہمارا کیا لینا دینا۔

کہتے ہیں، مرنے سے پہلے مرنے والی کہہ رہی تھی: یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔

لیکن اس کے علاقے کے لوگ کہتے ہیں، محبت جب ناکام ہو جاتی ہے تو ایک موت واقع ہوتی ہے یا پاگل خانے میں ایک پاگل کا اضافہ۔

اندیشوں کے درمیان ایک موت

سفید بستر پر لیٹنے سے پہلے وہ سوچ رہی تھی، شاید الوداعی رات کا کوئی حصہ ہے۔ اسٹریچر کی کھڑکھڑاہٹ اور بیماروں کی بھنبھناہٹ پر اس نے ابھی تک کان نہیں دھرے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی۔ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ سر کے آدھے حصے میں درد ہے۔ آنکھیں پوری کھل نہیں رہی ہیں کیا ہو سکتا ہے۔ واہمہ یا موت؟ موت ہی ہوگی۔ اس نے پاؤں کے انگوٹھوں کو زور زور سے ہلایا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ موت پاؤں سے شروع ہوتی ہے۔

"دور، پرے!" موت کو وہ مزے سے بھگانے پر تل گئی۔ جیسے یہ کوئی کھیل ہو۔ لیکن اچانک ڈاکٹر نے آ کر اس کی سوچ کو توڑ دیا۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ یہ وہ ڈاکٹر نہیں تھا جو ابھی بستر پر اس کے لیٹنے سے پہلے وارڈ کے کونے میں بے چارگی سے منہ کھولے، بڑھیا کی نبضیں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تو خوبصورت تھا۔ اور اس نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے سوچا تھا "اچھا، تو آپ میری بھی نبضیں دیکھیں گے۔" یہ کوئی دوسرا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ایک جھٹکے سے اس کے الٹے بازو کی آستین اس طرح الٹنے لگا جیسے یہ بھی اس کی ڈیوٹی کا حصہ ہو۔ دوسری طرف دیوار سے لگا

بلڈ پریشر کا آلہ اس نے ایک جھٹکے سے ایسے اٹھایا گویا وہ اس کے جسم کو بھی جھٹکا دینا چاہتا ہو۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈاکٹر پر ڈالی۔ بے زار لگتا ہے۔ بھیڑ جو ہے۔ ہر آدمی ہسپتال میں ایسے داخل ہو رہا ہے جیسے اپنی ہی موت کا پروانہ بغل میں دبائے ہو۔ سٹر، سٹر کرتا ہوا، کوئی دوڑتا ہوا، کوئی دروازے سے چیختا ہوا۔ لیکن ایسے جیسے موت کا پروانہ وہ ڈاکٹر کے منہ پر مار کر واپس چلا جائے گا۔ لیکن ان میں سے کچھ اس کی طرح کے بھی تھے۔

وہ بھی بستر پر لیٹی اس تبدیلی پر گم سم تھی۔ ابھی تو وہ گھر میں تھی، اور اپنی پسند کا کوئی گیت سن رہی تھی۔ اور اب اچانک اس حال میں۔ وہ بے زار ڈاکٹر کی شکل پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچ رہی تھی، یہ ڈاکٹر، ہوسکتا ہے کمپوڈر ہو۔ اور اتنی بے زاری سے مجھے دیکھتے ہوئے سچ مچ مار نہ دے۔

"کب سے بیمار ہیں؟" ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ بیمار! اس نے ڈاکٹر کے سوال اور چہرے دونوں پر غور کیا۔ "میں بیمار نظر آرہی ہوں، اتنی موٹی تازی؟"

"یہ بیماری، موٹے تازے کو نہیں دیکھتی"۔ "یہ بیماری..... کیا ہوگیا ہے مجھے؟"

"اچھا، اچھا، خاموش پڑی رہیں۔" وہ اس کی آستینوں کو جنہیں وہ پہلے ہی کھینچ تان کر اوپر لے گیا تھا اب اپنی چٹکیوں سے نیچے لا رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے ہاتھوں کی حرکت پر مداخلت کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے آستین نیچے اتارنا چاہی۔ "بس حرکت نہ کریں"۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ کو روک دیا۔ "ابھی آپ کو دوا ملتی ہے۔"

"جی؟" وہ اس کی جی کو سنے بغیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وارڈ سے باہر نکل گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ کوئی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی اپنی ہائے ہائے میں پڑے تھے۔ مریضوں کے ساتھ آنے والے اپنے اپنے مریضوں کے بستروں کی پٹیوں سے لگے کھڑے تھے اور ڈاکٹر کے رحم و کرم کا انتظار کر رہے تھے۔ اور مریض اس دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جس سے ڈاکٹر داخل ہوتا۔

اس نے دیکھا ایک نرس مشین اور ٹرالی کے ساتھ اس کے بستر سے لگی کھڑی تھی۔ نرس کو اس نے غور سے دیکھا۔ وہ جوان تھی اور نہیں بھی۔ ایسا کیوں؟ ایک نظر نرس پر ڈال کر اس مشین کو دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر اپنے ہی سوال کا جواب اس کے چہرے پر دوبارہ نظر ڈال کر ڈھونڈنے لگی۔ اس کے چہرے پر کہیں کہیں تازگی باقی تھی۔ آنکھیں اور اس کے ہونٹوں کے کنارے پر پڑی رہ جانے والی مسکراہٹ، باقی آنکھوں کے نیچے چھوٹے، ناک کے دونوں طرف کی لکیریں، جلد کی پژمردگی، اس کی جوانی کے آہستہ آہستہ جانے کی چغلی کھا رہے تھے۔ نرس نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ مشین کو دیکھ رہی تھی۔ "ای سی جی کرنی ہے، قمیض اٹھاؤ"۔ نرس کے جملے پر اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایسے ہی؟ یہ اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا، بس آنکھوں نے سوال کیا۔ نرس نے اُچک کر اس کے بستر کے قریب لٹکے پردے کو کھینچ دیا۔ پردہ جو صرف اتنا کھینچا جاسکتا تھا کہ اس کے آدھے جسم کو سامنے والے پلنگ پر لیٹے مریض سے چھپالے۔ پھر اس نے جس تیزی سے پردہ کھینچا، اسی تیزی سے اس کی قمیض الٹ دی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے لوہے کے بنے گولوں کو جو ایک پائپ میں مشین کے ساتھ بندھے تھے، اس کے سینے کے پاس رکھ دیا۔ "آپ ای سی جی لے رہی ہیں؟" اس نے نرس کی مستعدی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نرس نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس کی بریزیئر کو اوپر کھینچتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے لوشن لگاتے ہوئے اسے جن نظروں سے دیکھا، اسے ایسا لگا جیسے یہ نرس نہیں ہے بلکہ وہ ڈاکٹر ہے جو ابھی اس کی آستین اوپر کھینچ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے جسم میں ایک گجگجاہٹ پیدا کر رہا تھا۔ کیا لیچڑ پن ہے۔ مرنے سے پہلے اتنی گت بنے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ زندہ رہا جائے۔ اس نے سوچا۔ نرس ایک پرچی مشین سے پھاڑ کر مشین سمیت جاچکی تھی۔ اور جاتے ہوئے پردہ کھینچ گئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کیا وہ واقعی مر رہی ہے۔ ایسے کیسے ہوسکتا ہے، ابھی تو بہت سے کام باقی ہیں۔ وہ سوچنے لگی کیا کیا باقی ہے۔ لیکن جو جو باقی نظر آیا وہ اسے فضول نظر آیا۔ زندگی جو وہ گزار آئی تھی ویسے تو اس پر نظر ڈالی جائے تو اب وہ بھی فضول نظر آرہی تھی۔ لیکن مرجانا! یہ کیسے ممکن ہے میں مرجاؤں گی۔ اور لوگ۔ اس نے اپنے مرے ہوئے دوستوں کے ان ان دنوں کو یاد کیا

جب وہ مرے تھے۔ کچھ لوگ مرے ہوؤں کے اس سمیت مشترکہ دوست تھے۔ ہر ایک کے مرنے کے دن، وہ ایک ہی طرح منہ لٹکائے ہوئے ملتے۔ ایک ہی طرح کی سرگوشیاں، چی چی، کیا، کیوں اور کیسے۔ بس اسے لگا جیسے وہ بار بار یہ جملہ سننا چاہتے ہوں۔ مرگیا، مرگیا، اف! کیا یہ سب کچھ گھسا پٹا اس کے ساتھ بھی ہوگا۔ کوفت اور کراہیت! ابھی وہ کراہیت کا پورا تھوک حلق میں نگل ہی رہی تھی کہ وہ ڈاکٹر پھر اس کے سرہانے کھڑا ہوا تھا۔ ''منہ کھولیں، زبان اوپر کریں''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ڈراپ اس کی زبان کے نیچے ٹپکا دیا۔ کڑوی بوند اس کی زبان پر پھیل گئی۔ اس نے بوند کی کڑواہٹ کو آنکھیں بند کرکے محسوس کیا۔ کیسا لگ رہا ہے؟ ایک آواز اس کے پائنتی سے آئی۔ اس کا شوہر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ منہ کھول کر کچھ کہنا چاہ رہی تھی، لیکن اسے یاد آیا بوند منہ میں پڑی ہے اور اس کی زبان کے نیچے کی کھال سے کسی کیمیاوی عمل کے نتیجے میں وہ اس کے جسم میں سرایت کررہی ہوگی۔ ہوں، اس نے سر کے اشارے سے اپنے شوہر کو تسلی دی۔ لیکن اس تسلی میں یہ بات واضح تھی کہ وہ اس کی توجہ اس طرح چاہتی ہے کہ وہ یہاں سے ہلے بھی نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے چہرے کو بھی دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی، اس کے چہرے سے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ اس کے مرجانے کے بعد وہ خوش ہوگا، یا اس کے زندہ بچ جانے سے۔ ابھی اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ سپاٹ بھی نہیں، بلکہ ایسا جیسے وہ ٹی وی پر خبریں سننے کے لیے یا کوئی فلم دیکھنے کے لیے بنالیتا تھا۔ ایک نرس کی آواز آئی، ''وارڈ خالی کریں۔ سب یہاں جمع نہ ہوں'' سب! اس نے دیکھا سب میں سوائے مریضوں کے اور کون کون ہے۔ ہر مریض کے پلنگ سے لگے دو، دو، تین تین لوگ کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ کھسک گئے۔ اس نے اپنے شوہر کو ایسے دیکھا جیسے مجبوراً کہہ رہی ہو، جاؤ۔

''ہاں جاتا ہوں''۔ وہ اس کا اشارہ جانتے ہوئے باہر چلا گیا۔ اسے پھر ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ''کیوں میڈم ای سی جی ہوگیا؟'' میڈم؟ اس نے آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وارڈ کی مدھم روشنی میں ڈاکٹر کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ''میں نے۔ آپ......؟''

''جی تیرہ سال پہلے۔ میں آپ کا''۔

اس نے سر گھما کر پھر ڈاکٹر کو غور سے دیکھا۔ یاد نہیں۔ چہرہ بالکل اجنبی۔ کیا کالج میں؟...... اس کے میڈم کہنے سے وہ صرف یہی سمجھی اس کا کوئی اسٹوڈنٹ ہوسکتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے۔ اکثر لوگ اب اُسے میڈم ہی کہنے لگے تھے۔ ''مجھے یاد نہیں''۔ اس نے دوبارہ ڈاکٹر کو اپنے قریب دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں۔ لیکن اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''مجھے یاد ہے''۔ زیادہ تفصیل سے وہ یاد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حلق کے نیچے کڑوی بوند، کسیلی سی ہوکر پھیل رہی تھی۔ اب تو دیر ہوچکی ہے۔ پھر بھی پاؤں کی سنسناہٹ باقی ہے اور سر کا درد۔

''یہ تو اور بڑھ گیا، میڈم''۔ یہ لفظ پھر اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ ''وزن کم کریں''۔

وہ بے چارگی کی ہنسی ہنسی۔ ''وہ تو کم نہیں ہوسکتا''۔

''کیوں؟''

''کھاتی بہت ہوں''۔

جی؟ اس نے ایک لمحہ رک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

''ہاں ہاں۔ کھاتی بہت ہوں''۔

اچھا۔ اب کیسا لگ رہا ہے۔ وہ رک کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''متلی لگ رہی ہے''۔

متلی، ہوں۔ ڈاکٹر نے پھر بلڈ پریشر کا آلہ جو دیوار سے چپکا ہوا تھا کھینچا اور اس کی آستین جواب آدھی پہلے ہی سے اوپر کھینچی ہوئی تھی، پکڑ کر اوپر کھینچی۔ جب وہ بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا وہ سوچ رہی تھی، اگر وہ مرگئی ابھی اس وقت تو؟ کتنی ڈل موت ہوگی۔ ہارٹ فیل سے مرنا اسے انتہائی نامعقول موت نظر آئی۔ وہ ہمیشہ ایک عجیب موت مرنا چاہتی تھی۔ ایک ایسی موت جس کو بہت دیر تک لوگ یاد رکھیں۔ کسی کارنامے کی شکل میں۔ لیکن...... اس سوچ کے بیچ میں ہی ڈاکٹر کی انگلیاں اس کی پسلی سے ٹکرائیں۔ جو

لامحالہ جلدی میں بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے ٹکرائی ہوں گی۔ لیکن۔ پھر...... سوچ اور اس ٹکراؤ میں ایک فاصلہ تھا۔ وہ ٹکرا کر رک گئیں تھیں یا اُسے صرف محسوس ہوا۔ اس نے آنکھ کھول کر ترچھی نظر سے ڈاکٹر کی انگلیوں کی طرف دیکھا اس نے جلدی سے انگلیاں ہٹالیں اور منہ کھول کر پٹی کھولنے لگا جیسے پکڑا گیا ہو اور وہ سوچتی رہی یہ اس کا واہمہ ہے یا...... مرنے سے پہلے وہ یہ کیا سوچ رہی ہے۔ سر کا درد، متلی، پاؤں میں سنسناہٹ اور موت کا نامعلوم خوف اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ، واہمہ۔ اس کی مسکراہٹ جو ہونٹوں پر آنے والی تھی، اس کی آنکھوں میں تیر گئی۔ ڈاکٹر نے اسی وقت پلٹ کر اسے دیکھا۔ اچانک یہ واہمہ اس کے بدن میں تیر گیا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میڈم۔ ڈاکٹر۔ ڈیوٹی اور وہ مریض۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وارڈ کی مدھم روشنی میں، نیم کھلے ہوئے پردے کے پیچھے، اس واہمے سے بچنے کے لیے اس نے کان دوسری طرف لگائے۔ اُدھر مردوں کا وارڈ تھا۔ زور زور سے کسی کے قے کرنے کی آوازیں اور قدموں کی ہبڑ دھبڑ سے پتہ چل رہا تھا کوئی مریض سیریس ہے۔ اُدھر مردوں کا ایمرجنسی وارڈ تھا۔ وہ بھی ایمرجنسی وارڈ میں لائی گئی تھی۔

''ہاں بھئی۔ میں یہیں کھڑا ہوں باہر''۔ اس کا شوہر اس کے پائتی کھڑا تھا۔ ضرورت ہو تو بلا لینا۔ اس نے منہ میں بھرے تھوک کو ڈسٹ بن میں تھوکتے ہوئے شوہر کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کا شوہر اس کے اس اشارے کو سمجھ نہیں پایا۔ وہ اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لاکر پوچھنے جا رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی آواز پھر آئی۔

''آپ باہر جائیں''۔ یہ کوئی اور ڈاکٹر تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن تھا۔ یہ کیوں؟ اس نے شوہر کو باہر جاتے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا بلڈ پریشر اُتر نہیں رہا۔''

کیوں؟۔ وہ کچھ کہے بغیر انجکشن لگا کر واپس جا چکا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اتنی بے کار صورت حال ہے۔ وہ بستر پر پڑی ہے اور ایک غیر محسوس طریقے سے اس موت سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے جو اس کے لیے غیر یقینی ہے۔ لیکن ڈاکٹروں

کے چہرے بتا رہے ہیں کہ شاید کچھ ہو جائے۔ بستر کے ہلنے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا شوہر اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ ''اب کیا حال ہے؟''

''مجھے یورین پاس کرنا ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں شوہر سے کہا۔

یہ سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ یہ اسپتال ،تمام سرکاری اسپتالوں کی طرح، بہت گندی حالت میں تھا۔ باتھ روم کی طرف وہ تیزی سے اٹھ کر چلی۔ اس کا شوہر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ وارڈ سے نکل کر باہر اندھیرا شروع ہو جاتا تھا۔ اور باتھ روم۔ بے تحاشہ بدبو کا بھبکا، اندھیرے سے مل کر اس کے حلق میں نتھنوں کے ذریعے اتر گیا اس کا الٹی کر دینے کو دل چاہا۔ دروازے تک پہنچ کر وہ واپس ہوئی۔ اس کا شوہر اب اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدھے، پھر الٹے ہاتھ پر مڑ کر تیز تیز آگے کی طرف لے گیا۔ ''یہ قدرے بہتر ہے یہاں چلی جاؤ''۔ اچھا، اس نے اندر جھانکا۔ اندھیرا یہاں بھی تھا، لیکن بدبو بہت کم۔ وہ یورین پاس کر کے باہر آئی۔ واپس وارڈ میں اس کا بستر خالی نہیں تھا۔ ایمرجنسی مریض سے گھر گیا تھا۔ بائیں طرف کا بستر خالی تھا۔ وہ وہاں لیٹ گئی۔ وہ ڈاکٹر اور اس کے ساتھ دوسرا ڈاکٹر بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے اس کے بیڈ کے قریب آئے۔ بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد ان کے چہروں پر ہاں اور نہ کے ملے جلے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ تو کیا ابھی تک...... وہ چونکی۔ دوسرا ڈاکٹر اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کو کوئی پریشانی ہے؟'' نبض دیکھنے کے بعد اس نے پوچھا۔ وہ کھڑکی کے ہلتے ہوئے پردے کے پرنٹ کو دیکھ رہی تھی جو جانے کب سے پڑے پڑے اپنا رنگ کھو چکا تھا۔ ''جی...... نہیں، ہاں۔ پریشانی کس کو نہیں ہوتی''۔ ان میں تو رہنا ہوتا ہے ہم جیسے لوگوں کو۔ اس نے آخری جملہ دل ہی دل میں کہا۔

''ہوں۔ کوئی زیادہ؟ یہ آپ کے شوہر ہیں؟'' اس نے اشارے سے اس کے ذرا دور کھڑے شوہر کو دیکھ کر کہا۔

''جی۔''

''ابھی آپ یہاں رُکیں گی''۔

''رکوں گی؟''

''جی۔ یورین پاس ہوا؟''

جی۔ اس نے مدھم روشنی میں غیر محسوس بے چینی کے درمیان ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''ایک دو دفعہ اور جائیں گی تو شاید کچھ بہتر ہو جائیں۔''

کچھ بہتر؟ اس کے کان کھڑے ہوئے۔ یعنی ابھی تک وہ موت کے منھ پر کھڑی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ مشکل زندگی تو جھیل لیں اور موت پر کوئی قابو نہیں۔ دیکھتی ہوں کیسے آتی ہے؟ مذاق سمجھا ہوا ہے۔ جب چاہے جیسے چاہے اُٹھا لے جائے۔ کیوں بھئی؟ دیکھتی ہوں کیسے آتی ہے میرے پاس۔ یہ سوچتے ہوئے وہ ہنس دی۔ برابر کے بیڈ پر آئی ہوئی، نحیف و نزار عورت نے پوپلے منھ کو اس کی طرف کر کے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو، ہنس رہی ہو۔ کب تک ہنسوگی۔ اس کا دل چاہا اپنے شوہر کو بلا کر کہے، ایک سگریٹ جلا کر دو۔ ایک کش۔ لیکن، اسپتال اور پھر ڈاکٹر ابھی پکڑ لے گا۔ وہ پھر آنکھیں موندنے لگی۔ غنودگی تو ہے۔ یہ غنودگی اگر بڑھ جائے۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ ڈاکٹر پھر دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے اس کے قریب کھڑا تھا۔

''میڈم آپ کو رکنا پڑے گا''۔

''جی؟''

''ہاں آپ کا بلڈ پریشر انجکشن کے بعد بھی......'' یہ کہہ کر وہ رک گیا...... اور غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اب وہ جان رہی تھی۔ لمحہ لمحہ آگے کی طرف بڑھا جا رہا ہے۔ لیکن انتہائی رازداری سے۔ اتنی رازداری تو اس نے زندگی میں کسی سے نہیں کی تھی۔ پھر موت کیوں؟ اُسے پھر یورین پاس کرنے کی طلب ہوئی۔ وہ جھٹکے سے اُٹھی اور باہر کھڑے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھی۔ اب اُسے وہ راستہ معلوم تھا۔ سیدھے، پھر الٹے۔ اور جب وہ باہر آ رہی تھی تو سوچ رہی تھی، آخری بار جب اس کی ماں باتھ روم جا رہی تھی تو باہر آ کر اس نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا تھا، ''اچھا بھئی،

اب تم خود کو سنبھالو، میں تو چلی''۔ اور سب نے اُسے ایسے ہی دیکھا اور سنا تھا۔ جیسے کسی ڈرامے کے آخری سین پر لوگ گومگو میں رہتے ہوئے، دیکھتے ہیں۔ وہ واپس وارڈ میں آئی۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا، اس بار پھر اس کا بستر کسی دوسری مریضہ نے لے لیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب، میں؟''

ڈاکٹر نے اشارے سے اُسے پیچھے آنے کے لیے کہا، ''آپ کو اوپر تیسری منزل پر ڈاکٹرز ڈیوٹی روم میں رکنا ہوگا''۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی ڈیڈ باڈی کو زندہ لوگوں کے سامنے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈاکٹر اس کے شوہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اور تیز تیز۔ جیسے دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ تیز تیز۔ سر کا درد، متلی اور پاؤں کی سنسناہٹ بھلائے ہوئے۔ ایک ۔ دو ۔ تین، وہ سیڑھیاں گنتی جا رہی تھی۔ جیسے وہ بھی ڈاکٹر اور اپنے شوہر کی طرح بیمار نہ ہو۔ لیکن تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے اس کے دماغ کی رو کسی اور طرف ہولی۔ اتنی رعایت اور توجہ میرے ساتھ...... سرکاری اسپتال میں ایسا کیوں؟ یہ ڈاکٹر کون ہوسکتا ہے۔ میرا اسٹوڈنٹ، کوئی شناسا۔ نہیں۔ مجھے تو اس کا چہرہ بالکل اجنبی رہا ہے۔ پراسراریت نے آہستہ سے اس کے دل پر دستک دی۔ بغیر کسی تشویش کے اس کا شوہر ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ باتیں کرتا ہوا، آگے جا رہا تھا۔ جبکہ اس کے ہاں تشویش کے بہت سے چینل کھل گئے تھے۔

''یہ ڈاکٹرز کا کمرہ ہے۔ آپ یہاں آرام کریں۔ ابھی آپ کو جانے نہیں دیا جاسکتا۔'' ایک کمرے کے سامنے ڈاکٹر نے رکتے ہوئے کہا۔

وہ اور اس کا شوہر اندر چلے گئے۔ کمرہ قدرے صاف ستھرا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اب وہ لیٹنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے شوہر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، ''بڑا خیال رکھ رہے ہیں۔ یہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں''۔ اس نے سر ہلایا۔

''یہ ڈاکٹر کہتا ہے تیرہ سال پہلے یہ مجھے پرانے کالج میں ملا تھا۔ جو میں تین سال پہلے چھوڑ چکی ہوں۔''

''یعنی آپ کا شاگرد ہے؟'' اس نے دیکھا اس کے شوہر کے چہرے پر ایک سایہ سا ہٹ گیا ہے۔ اور ایک اطمینان سا نظر آیا۔ اُسے صاف نظر آیا کہ وہ بھی اس تشویش کی زد میں آ رہا تھا جو اس کے دل میں سر اُٹھا چکی تھی۔

''لیکن میں یاد نہیں کر پا رہی ہوں کہ یہ کب میرا شاگرد تھا''۔

''تمہارا کوئی چاہنے والا، ہاں؟'' اس نے ہاں سوالیہ انداز سے کہا۔

''توبہ کرو۔'' اس نے ڈاکٹر کی شکل و صورت کو نگاہ میں ٹھہرایا، بغیر کسی کشش کے۔ کوئی پرسنیلٹی بھی نہیں۔ ''توبہ کرو''۔

''بھئی وہ تمہارا فین ہوگا۔ جوانی میں۔''

ہاں۔ وہ اس دفعہ بھی تشویش کے ساتھ ہاں کہہ رہی تھی اور ایک نئی گرہ کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی، یہاں لانے کا مقصد کیا صرف یہی ہے کہ وارڈ بھر گیا۔ یا...... اس کی سوچ آگے بڑھی۔ وہ بستر پر اچھل سی گئی۔ یہ ابھی اس کے شوہر کو باہر جانے کے لیے کہے گا۔ یہ سوچ آتے ہی اس نے خود کو روکا۔ کیا بکواس ہے۔ ایسا کیوں سوچ رہی ہوں۔ ابھی تو موت سے لڑ رہی تھی۔ جو بے تکے پن سے چلی آ رہی ہے۔ ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ پانی پی لیں۔ اور آرام کریں۔ دیکھئے آج رات ہمیں انہیں یہاں روکنا ہوگا''۔ اس نے اس کے شوہر کو مخاطب ہو کر کہا۔ اور باہر چلا گیا۔ اب وہ جان رہی تھی اس کے شوہر کے چہرے پر بھی تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ لیکن وہ ایک عجیب سی مسکراہٹ سے بولا، ''اتنا خیال تمہارا رکھ رہا ہے۔ بڑا اچھا ڈاکٹر ہے''۔

وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی، تم باہر مت جانا، میرے ساتھ کمرے میں رہنا۔ لیکن وہ لفظ زبان پر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن اس نے شوہر کی باتوں کا جواب ایک گہری ''ہوں'' میں دیا۔ ''کیا...... کیا ہوا؟'' شوہر اس کی سنجیدگی پر پھر بول اٹھا۔ ''اب تم باہر مت جانا''۔

''کیوں؟''

''بس کہہ دیا نا''۔ وہ زیادہ دیر تک خوف دبا نہ سکی۔

''میں کہاں جا رہا ہوں ہوں، یہیں ہوں''۔ اس کے شوہر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ شاید وہ اس کی آنکھوں کے استفسار کو پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ آنکھیں موند کر لیٹی رہی۔ لیکن غنودگی ابھی اس پر سوار تھی۔ اس نے غنودگی سے بچنے کے لیے جو اُسے نیند کی طرف لے جا رہی تھی، پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی ایک دوست اسی غنودگی میں ہی مر گئی تھی۔ اس نے بستر پر بیٹھنا چاہا۔

''لیٹی رہیں''۔ ڈاکٹر پھر داخل ہوا اور اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔ جب وہ کمرے سے جا رہا تھا تو اس نے ایک بار پلٹ کر اس کے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف ایک نگاہ ڈال کر باہر نکل گیا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''آپ نے پوچھا نہیں کتنا ہے؟''

''ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے۔ وہ خود تمہیں بتائے گا۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گی''۔

''اچھا تو میں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی، انجکشن بھی لگ گیا۔ کتنی بار یورین پاس ہوا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ بس رات بھر رکو گی۔ تو ٹھیک ہو جاؤ گی''۔

''لیکن آپ یہاں سے جائیں گے نہیں''۔

''اچھا بھئی''۔ اس کے شوہر نے شاید اس کو بولنے سے روکنا چاہا۔ ڈاکٹر پھر ایک پرچی لیے ہوئے تیزی سے داخل ہوا۔ ''آپ یہ انجکشن لے آئیں، نیچے ملتا ہے''۔

''جی'' ان دونوں نے جس طرح جی کہا جیسے دونوں اس بات کو پہلے سے جانتے ہوں، ''بہت ضروری ہے''۔ وہ حیران ہو رہی تھی۔ اس نے تو پہلے ہی سوچا تھا اور وہی ہوا۔ ڈاکٹر وہیں کھڑا رہا، اس کا شوہر عجیب مسکراہٹ سے اُسے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر انجکشن لانے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر دروازے تک گیا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہا اور وہ سوچنے لگی یہ اندیشہ ہے، اسے اس طرح کیوں سوچا جائے۔ ایک اندیشہ ہی تو مجھے یہاں بھی لایا ہے کہ موت میرا پیچھا کر رہی ہے اور یہ دوسرا۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ لیکن تیز

قدموں کی چاپ نے اُسے سر اٹھانے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر بلڈ پریشر کا آلہ ہاتھ میں لیے ہوئے داخل ہوا اور اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے چیک کیا تھا اور یہ بستر پر پہلے تو نہیں بیٹھا۔ اسی دوران ڈاکٹر اس کی بانہہ پکڑ کر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔ پھر اسٹیتھو اسکوپ سے اس کی سانس کے اتار چڑھاؤ سننے لگا۔ ''آپ کی دھڑکن تیز ہے''۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن صاف نہیں ہے''۔

''جی؟ تیز ہے اور صاف نہیں ہے...... یہ کیا؟ ہاں۔ وہ اس کی جیبر کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جو اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسٹیتھو اسکوپ کی حرکت جو ڈاکٹر کے ہاتھ کے ساتھ اس کے سینے پر منڈلا رہی تھی، محسوس کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی: میں سینتالیسویں سال میں ہوں اور ایک ڈاکٹر کی اسٹیتھو اسکوپ کی حرکت کو اندیشے میں تبدیل کر رہی ہوں۔ ممکن ہے اس کے خیال میں کچھ بھی نہ ہو، یہ صرف اس کا ہی واہمہ ہو۔ لیکن وہ چونک اٹھی۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا، ''میں قمیض کے نیچے سے دیکھ لوں؟ آپ کے دل کی حرکت صاف سنائی نہیں دے رہی'' اس نے بے اختیار زور سے سر نہیں میں ہلایا۔ وہ تو پہلے ہی بھانپ چکی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ اور...... پھر وہ اسٹیتھو اسکوپ ہٹا کر بہت تحمل سے بیٹھا رہا اور پوچھنے لگا۔ ''آپ اپنے شوہر سے خوش ہیں؟''

''جی ہاں'' وہ اپنے اندیشے کو دبا کر اس کے سوالوں کا جواب دینے لگی۔ ''وہ میرے شوہر بھی ہیں، اور دوست بھی''۔

''وہ آپ کو خوش رکھتے ہیں؟''

''جی ہاں، جی، میں بھی خوش ہوں''۔

''لیکن بلڈ پریشر تو کچھ اور کہہ رہا ہے''۔ وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا وزن، مری عمر''۔

''نہیں، فلکچویشن کچھ اور کہہ رہی ہے۔ آپ اپنا پورا چیک اپ کروائیں، کل او پی ڈی میں آ جائیں''۔ یہ کہہ کر وہ ایک دو منٹ بیٹھا رہا۔ وہ بے سدھ، خاموش اور اس کے ارادے اور اپنے خدشے کے درمیان جھولنے لگی۔ پھر باہر قدموں کی چاپ پر وہ ایک دم اٹھا اور جاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کی ایک لخط رکاوٹ سے اسے ایسا لگا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش گم سم پڑی رہی اور اپنی اس گومگو حالت پر کڑھنے لگی۔ کیا یہ اندیشہ ہے؟ یا سچ مچ یہ ڈاکٹر کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہے۔ جس خوف میں وہ داخل ہو رہی ہے، وہ سمجھ نہیں سکی اپنی اس حالت پر ہنسے یا روئے۔ یہ دوہرا خوف تھا جو اس کے دماغ میں رینگ رہا تھا۔ ابھی موت سے لڑ رہی تھی۔ دوبارہ ڈاکٹر کے قدموں کی آواز پر وہ چونکی۔ اس کے ہاتھ میں ایک انجکشن تھا۔ ''یہ کیا؟'' اس نے انجکشن دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ آپ کو لگنا اب ضروری ہے۔ لیکن بازو پر نہیں۔ کولھے پر''۔

''لیکن یہاں نرس بھی تو ہے''۔ اس نے احتجاجی آواز میں کہا۔

''اس کا ہاتھ سخت ہے''۔

''ہاتھ سخت ہے، کیا مطلب؟'' وہ ڈاکٹر کے ارادوں کو اب صرف اندیشے کا حصہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ بھی جان رہا تھا۔ اڑنا بے کار ہے۔

''اچھا نرس کو بھیجتا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے وہ مڑا۔ اسی وقت اس کا شوہر داخل ہوا۔ نرس بھی انجکشن لگانے آ گئی تھی۔ اس کے شوہر کو باہر کھڑا کر کے اس نے اس کے کولھے پر انجکشن لگایا۔ نرس کا ہاتھ سخت نہیں تھا۔ کمرے میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کے شوہر نے پوچھا، ''یہ انجکشن کیوں؟''

''پتہ نہیں۔ ڈاکٹر لگانے کے لیے آیا تھا۔ میں نے منع کر دیا پھر اس نرس کو بھیجا''۔ وہ اپنے خدشے کو اب اس طرح الفاظ دے رہی تھی جیسے بتانا چاہتی ہو کہ یہ صرف خدشہ نہیں رہا اور۔ اور تمہارے جانے کے بعد وہ بستر پر بیٹھ کر میرا بلڈ پریشر چیک کر رہا تھا۔

اور...... اور کیا؟

اس کے شوہر نے بے اطمینانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پوچھ رہا تھا آپ کے شوہر آپ کو خوش رکھتے ہیں۔ اس نے ساتھ ساتھ یہ سوچتے ہوئے کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں...... لیکن

وہ جلدی سے ہٹا گئی کہ وہ اجازت لے رہا تھا۔ قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر اسٹیتھو اسکوپ سے دل کی دھڑکن دیکھنے کے لیے......

"تو کیا ہوا؟ ڈاکٹر ہے۔ اُسے پتہ ہے اُسے کیا کرنا چاہیے......" اس کے شوہر کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے کچھ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

"لیکن وہ تمہارے سامنے بستر پر کیوں نہیں بیٹھا"۔ یہ سنتے ہوئے اس کے شوہر کی آنکھیں اب پھیل سی رہی تھیں۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ اس کا شوہر اچانک ہنسنے لگا۔ "کیا ہوا؟" وہ سر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ "ڈر گئیں؟"

"میں؟ نہیں تو ابھی تک تو نہیں ڈری۔ صرف سوچ رہی ہوں۔" اور واقعی ابھی تک اندیشہ اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ اندیشے کے پیچھے نہیں دوڑی تھی۔ تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ دو دفعہ وہ یورین پاس کرنے باتھ روم گئی۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر پھر کمرے میں آیا۔ "آپ لوگ دوسرے کمرے میں شفٹ ہو جائیں۔ کمرہ خالی کروا لیا ہے"۔ وہ دونوں اس کمرے میں آ گئے جس میں ایک پردے کا پارٹیشن اسے دوسرے کمرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ دوسری طرف بھی کوئی مریض تھا۔ ادھر دو بستر تھے جن پر ایک پر وہ اور دوسرے پر اس کا شوہر بیٹھ گئے۔ "یہاں تم ڈرو گی نہیں"۔

"کیوں؟ تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے کیوں ڈروں گی"۔ یہ کہتے ہوئے وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ ایک بار پھر پاؤں کی سنسناہٹ، سر درد اور متلی۔ لیکن موت کے خوف کے باوجود وہ سوچ رہی تھی، شاید بچ جاؤں۔ شاید اسی تسلی کے درمیان ہی......

اس نے پھر خوف سے بچنے کے لیے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا شوہر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کمرے کی فضا میں ایک پراسرار ہوا گردش کر رہی ہے۔ اس نے درمیان کے پردے کو ذرا سا سرکا کر دوسری طرف جھانکا۔ اس کے بیڈ سے ملے ہوئے بیڈ پر جو بھی لیٹا تھا وہ سر سے پاؤں تک چادر ایسے اوڑھے تھا جیسے کسی لاش پر چادر ڈال دی گئی ہو۔ دوسری طرف بیڈ پر لیٹا ہوا آدمی آنکھیں کھولے چھت تک رہا تھا۔ وہ ایک منٹ تک ادھر کے حصے کو دیکھتی رہی جو پردے کے دوسری طرف تھا اور

انتہائی خاموش اور ساکت، جامد...... ایسا لگ رہا تھا جیسے ادھر کوئی سانس بھی نہیں لے رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر پردہ چھوڑ دیا اور خود بھی چھت تکنے لگی...... ایک عجیب سی باس اس کی ناک میں داخل ہو رہی تھی...... مٹی، دھول اور کوئی غیر مانوس سی باس جو بہت سے اندیشوں سے مل کر اس کے حلق سے اس کے پیٹ میں گھس رہی تھی۔ وہ ساکت لیٹی رہی۔ اچانک پنکھے کی ہوا نے زور سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"

"شاید ڈھائی بجے ہیں"۔ اس نے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ تھکا ہوا سا تھا اور بے چین نظر آنے لگا تھا۔ اس نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "سو جائیں"۔

"یہاں نیند کس کو آئے گی۔ تم سو جاؤ"۔ وہ اس کی طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ لیکن...... مجھے بھی کیسے نیند آئے گی۔ یہ جملہ منہ سے نکلتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس نے اپنے شوہر سے چھپائے اور آنسوؤں کے ریلے میں ہی اس نے اپنی زندگی کو پیچھے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کیسا گزرا ہے یہ سب وقت۔ اچھا ہاں اچھا ہی گزرا ہوگا۔ سب رشک کرتے ہیں۔ میری زندگی پر اور میری ہمت پر۔ کیا اختتام آن پہنچا؟ اس کے بعد کون یاد کرے گا۔ کوئی کرے گا؟ اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھلنے کی آواز آئی۔ ڈاکٹر ایک پرچی ہاتھ میں لیے داخل ہو رہا تھا۔ اس کا شوہر بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ "آپ یہ دوا لے آئیں۔ یہ کھانے کے بعد شاید یہ اتنی بہتر ہو جائیں کہ......"

"لیکن اب تو تین بج رہے ہیں۔ اس نے خوف کو دباتے ہوئے زور سے کہا۔

"لیکن یہ دوا ضروری ہے۔ ایک مریض کے ساتھ یہی ہوا تھا ہم نے اُسے اس حالت میں جانے دیا۔ لیکن راستے میں ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی"۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا اور موت کے اندیشے کے ساتھ ساتھ ایک اور اندیشہ اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریوں کی طرح ناچنے لگا...... اس نے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا جس پر استفسار تھا۔ جاؤں یا نہ جاؤں؟ اس

نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک خفیہ سی رازداری پھیلی ہوئی تھی۔ ''نہیں، مجھے دوا نہیں چاہیے۔ مجھے گھر جانا ہے''۔ ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہوسکتا ہے تشویش کا وہ رخ ہو جسے وہ پہچان گیا ہو۔ ''اچھا ٹھیک ہے جائیں، لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں''۔ وہ بستر سے یہ کہتے ہوئے کودی۔ ''بس گھر چلیں''۔ اس نے اپنے شوہر سے روہانسی آواز میں کہا۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو ڈاکٹر کا یہ جملہ اس کے کان دہرا رہے تھے۔ ''مریض راستے ہی میں......'' اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ ہوا کے جھونکے سے نامعلوم اندیشے کی باس اس کے نتھنوں میں گھس گئی، متلی کے تکلیف دہ احساس کے ساتھ اس کے قدم موت اور خفیہ رازداری کے درمیان سے اس کو نکال کر باہر لے جا رہے تھے۔ اس کا شوہر اور ڈاکٹر اُسے آوازیں دیتے رہ گئے اور وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہی تھی، شاید یہ الوداعی رات کے اختتام کا آخری حصہ ہی ہو۔

پورٹریٹ

جب پہلی بار میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی، تو دروازہ اس نے ہی کھولا تھا۔ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ اس کے نام کی بڑی دھوم تھی۔

میں اکثر اس کی تصویروں کی نمائش میں جاتا رہتا تھا لیکن کبھی اس سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ ایک دن میں نے فون پر اس سے ملنے کا وقت لے لیا۔ وہ دروازے پر تھا۔ ''ہاں اور کیسے ہیں؟''

''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔'' اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازے سے مجھے اندر آنے کے اشارے کے ساتھ کہا۔

''جی ہاں! آپ کی تصویروں کی نمائش میں میں اکثر جاتا ہوں، بڑے اچھے اسٹروک ہوتے ہیں، آپ کے کلر بڑے جاندار، لگتا ہے بے خیالی میں لگائے گئے اسٹروک ہیں لیکن ان میں حرکت آپ کی چابکدستی کا پتہ دیتی ہے، ہر اسٹروک لائف سے بھرپور، پھر آپ کے لینڈ اسکیپ، یوں معلوم ہوتا ہے، وہیں کھڑے ہیں جو آپ دکھانا چاہتے ہیں۔'' میں اتنا کچھ کہتے ہوئے، اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی جگہ بنا چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر سگریٹ جلایا اور مجھے ٹیک لگانے کے لیے کشن دیا۔ میں نے غور سے اس

کے کمرے پر نظر ڈالی۔ کیا خوب! تمام تصویریں اس کی بنائی ہوئی دیواروں پر لگی تھیں، لیکن ان میں سے ایک تصویر۔

"یہ پورٹریٹ کس کا ہے؟"

"یہ؟ یہ کسی کا بھی ہوسکتا ہے۔ بنانے والا زندہ ہے تو بتا سکتا ہے، کس کا ہے، لیکن مرگیا تو یہ صرف اس فنکار کا شاہکار ہے۔ جس کو دیکھ کر آپ چونک گئے۔"

"جی ہاں، جس کا بھی ہے بہت خوبصورت ہے۔"

تصویر میں وہ چہرہ ایک عورت کا تھا لیکن اس کے نقوش اتنے اہم اور واضح تھے اور ان پر پھیلا ہوا تاثر گویا آرٹسٹ نے اپنے تمام ماہرانہ صلاحیتوں کو اس میں استعمال کیا ہے۔

وہ ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔

"لیکن آپ ابھی تو بتا سکتے ہیں کہ....." میں نے تھوک نگلتے ہوئے اور اس تصویر کے حسن سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! میری بیوی تھی"۔

"تھی؟"

جی ہاں۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔

"وہ کہاں ہے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اس لیے کہ میں دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر ایک سایہ بن رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا تھا اور اپنے دونوں پاؤں کے درمیان کی زمین کو گھورنے لگا تھا" دراصل وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے وہ کسی اور کے ساتھ رہنے لگی۔"

"تو گویا وہ کسی اور کے ساتھ رہنا چاہتی تھی" میں نے عجیب بودا سا سوال کردیا۔

"نہیں، دوسرا کوئی اور اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔"

"آپ اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے؟" میں نے حمق سے منہ کھول کر، نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کردیا۔

"پہلے ایسا نہیں تھا، پہلے میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ میری نظر میں اس کی اہمیت ختم ہوگئی تھی۔" یہ کہہ کہ وہ چپ ہوگیا لیکن اس کی آنکھوں کی بے چینی اور میرے دل میں اس پورٹریٹ کے حوالے سے جو استفسار بڑھ رہا تھا، شاید وہ بھانپ رہا تھا۔

"چونکہ آپ پہلے شخص ہیں جو اس پورٹریٹ پر رک گئے ہیں اور اتنی دلچسپی لے رہے ہیں..... لہٰذا" اس نے ایک مجھے غور سے دیکھا، اور پھر نئی سگریٹ جلا کر بولتا چلا گیا۔

"دراصل میں بیوی کو، خواہ وہ کسی کی بھی ہو ایک غیر اہم شے سمجھتا ہوں۔ اس عورت سے جب میرے مراسم ہوئے تھے اس وقت میں سمجھتا تھا میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن جوں ہی وہ میری بیوی بنی، مجھے ان تمام اشیاء کی طرح نظر آنے لگی جو میں گھر میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لایا تھا۔ بیوی بھی کچھ ایسی ہی نظر آنے لگی جو میرے ضرورتوں کو ہمہ وقت پورا کرے۔ میرا اس سے جذباتی تعلق ختم ہوگیا تھا۔ وہ بھی شاید سمجھ رہی تھی کہ میں نے اسے کون سا درجہ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے رویوں میں بھی تبدیلی آنے لگی تھی حالانکہ وہ پورے انہماک سے مجھے گھر میں مصروف نظر آتی۔ میرے مذاحوں کا خیال رکھتی۔ میری تمام ضرورتوں کو بروقت پورا کرتی۔ اپنے طور پر شاید اس حالت میں اسے رہنا منظور تھا۔ لہٰذا وہ نہایت اطمینان سے گھر کی چہار دیواری میں خود کو مصروف رکھتی۔

ساتھ ہی ساتھ وہ میری وہ تمام مصروفیات جو دوسری عورتوں سے معاشقے کے گرد گھومتی تھیں، انہیں بھی وہ خاموشی سے دیکھتی۔ اور اسے اس نے آہستہ آہستہ اپنی عادت کا حصہ بنالیا تھا۔ میں نے اسے اپنی حرکتوں کو اس طرح تسلیم کرتے دیکھا تھا گویا اگر اسے میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ سہنا پڑے گا۔

وہ میری حرکتوں سے بے خبر نہیں رہتی تھی بلکہ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی ہے لیکن میرے رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے

ایک غیر اہم شے کی طرح ہی دیکھتا تھا۔

اس کا اور میرا صرف اب بھی واسطہ تھا کہ وہ میری بیوی تھی، گھر کی تمام ضرورتوں کا ایک حصہ۔

خود میں ہر اس عورت میں دلچسپی لے رہا تھا جو میری بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ وہ کوئی بھی ہو، خواہ کسی کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ عورتیں جو میری بیوی بننے کی خواہش میں میرے قریب آتی تھیں، میں جلدی ان سے پیچھا چھڑا لیتا تھا۔ بعض دفعہ یہ عاشقانہ عادت مجھے جھنجھٹ میں بھی ڈال دیتی کہ کچھ عورتیں اپنا سب کچھ مجھ پر وار کر میری بیوی بننے کی پوری کوشش کرتیں، لیکن ایسے موقع پر میں اپنی بیوی کو آگے کر دیتا اور وہ انہیں انتہائی تحمل سے اور کبھی بہت سفاکی سے مجھ سے دور لے جاتی۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ میری ان حرکتوں پر پریشان نہیں تھی۔ کبھی اس نے مجھے یہ احساس دلانے کی اور اس رویے کی سزا اس طرح بھی دینا چاہی کہ وہ مجھے اپنے بستر پر تنہا چھوڑ دیتی۔ لیکن مجھ پر اس کے اس رویے کا اکثر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میں باہر سے اتنا سیر ہو کر آتا تھا کہ اس کے بستر پر ہونے یا نہ ہونے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بہت انجان بنی اس کھلواڑ میں اس طرح شامل ہوتی کہ میں حیران رہ جاتا۔

اب آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات عجیب و غریب نوعیت کے ہوتے جا رہے تھے، وہ کبھی میری دوست بن جاتی، اور کبھی رقیب اور کبھی وہ اس وقت میرا ساتھ دیتی جب میں اپنی کسی جنسی خواہش کی تکمیل کے بغیر گھر آتا۔ وہ جان جاتی اور ایسے سے وہ میری ضرورت اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ پورا کرتی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اب بار بار سمجھا رہی ہے کہ وہ غیر اہم نہیں ہے۔

اور پھر ایک دن جب کہ تمہاری طرح میرا ایک مدّاح مجھ سے ملنے آیا تھا، میری بیوی نے بھی اس کی معمول کے مطابق آؤ بھگت کی تھی کیونکہ یہ اس کے روزمرہ کے معمول کا حصہ تھا کہ میرے مداحوں کی خاطر مدارت کرے۔

"یہ میری بیوی ہے" میں نے اپنی فنکارانہ رعونت سے اس کا تعارف کرایا تھا۔

دوسروں سے میں اسے ایسے ہی متعارف کرواتا تھا۔ اور پھر اس کو مہمانداری کی طرف لگا دیتا۔ جاؤ پانی لاؤ، چائے لاؤ۔ اور وہ سیدھی سادھی، سگھڑ اور اپنے شوہر کا احترام کرنے والی بیوی کی طرح دوڑ جاتی تھی اور کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ میرے مداحوں کا استقبال کرتی۔

اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک اپنے مدّاح سے باتیں کرتا رہا تھا اور بار بار میری بیوی کمرے میں چائے، پانی اور دوسری چیزیں لا لا کر رکھ رہی تھی، لیکن اس درمیان نہ جانے کیا ہوا، اور کیسے اس نے میری بیوی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آمد و رفت کمرے میں بڑھ رہی تھی۔ میرا مدّاح اپنی دزدیدہ نگاہوں سے میری بیوی کی طرف دیکھ لیتا۔ نہ جانے وہ کون سی نظر تھی، جس نے میری بیوی کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ اس کو دیکھا جا رہا ہے۔

پھر وہ مدّاح مرے گھر میں بار بار آنے لگا لیکن اب اس کے ہاں میری بیوی کی مداحی بھی شامل تھی۔ وہ اس کے پکے ہوئے کھانے، اس کے کپڑوں اور اس کی چال پر کوئی نہ کوئی جملہ تعریف میں کہہ دیتا۔ ایسے وقت میں، میں اس کے چہرے پر وہ سرخی دوڑتے ہوئے دیکھتا، جو میری اور اس کی ابتدائی ملاقاتوں کے دوران اس کے چہرے پر نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے اس طرح اٹھنے بیٹھنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ میری نظر میں وہ ایک اچھی میزبان بھی تھی۔

لیکن اس خیال کی طاقت سے میں ایک دن ایک جھٹکے سے نکل گیا۔ اسی دن میں اپنی بیوی کو اپنے مدّاح کی خاطر تواضع کسی دوسرے ڈھب سے کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس دن عام دنوں میں پہننے والا لباس نہیں پہنے تھی۔ بلکہ اس دن میں نے اسے بہتر لباس میں نک سک سے خود کو سجائے ہوئے پایا۔ پہلے میں نے نوٹس نہیں لیا لیکن میں نے دیکھا کہ چائے کی پیالی میں چینی ڈال کر دیتے ہوئے جب وہ میرے مدّاح کی طرف جھک رہی تھی تو وہ واضح طور پر اپنے پستانوں کو اس طرح چھپا رہی تھی جو چھپنے پر نہیں آ رہے تھے۔ وہ خود کو دکھانے کے ایک نئے فن سے واقف ہو رہی تھی اور میں اس مدّاح

کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھ رہا تھا جو میری آنکھوں میں کسی دوسری عورت کو دیکھتے ہوئے پیدا ہو جاتی تھی۔ میں یہ سب کچھ بے حسی سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے یہ سب کچھ میرے لیے غیر اہم ہو۔ میں نے اپنی بیوی کو خود اس طرح دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو میرے لیے ایک شے کی شکل اختیار کر گئی تھی، اس کے اور میرے جنسی تعلقات بھی جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اب اس نوعیت کے تھے، جیسے میں روز برش کرتا ہوں، یا کپڑے بدلتا ہوں۔ اس سے زیادہ توجہ تو میں اپنی پینٹنگز پر دیتا تھا۔

وہ بھی میرے اس رویے کی عادی ہو چکی تھی۔ جب میں اپنی ضرورت کے تحت اس کے بستر کی طرف جاتا تو وہ اپنے کپڑے اس طرح اتار دیتی جیسے کوئی پیشہ ور بھک منگا، بھیک مانگ رہا ہو اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دے۔

میں نے اس کی اس حرکت پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی اس لئے کہ مجھے ایک عرصے سے اس کے جسم سے رومانس کی کوئی خوشبو نہیں ملی تھی، جو میں دوسری عورتوں میں، چاہے وہ کتنی دور کھڑی ہوں، مل جاتی تھی۔ بس ضرورت کی حد تک۔ بعض دفعہ تو جب باہر کسی عورت سے رومانس کرتے ہوئے مجھے مکمل جنسی تجربہ کرنے کی مہلت نہیں ملتی تو میں اس کی کمی اپنی بیوی کے جسم سے پوری کر لیتا جسے وہ جانے انجانے پوری ضرور کرتی۔

اس دن مجھے اس کا جسم خود کو دکھانے کے لیے بے چین نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خود کو چھپانے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہے اور اس وقت میری موجودگی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ رہی ہے۔ پہلی بار مجھے ایسے ہی لگا تھا جیسے یہ منظر میں بار بار دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اچانک مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ پہلی بار ہو رہا ہے۔ یہ کسی دوسرے کی بیوی نہیں ہے اور وہ میں نہیں ہوں۔ وہ میرا مداح ہے اور ادھر میری بیوی ہے لیکن اس منظر کو میں ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے کسی دوسرے کی پینٹنگز کے اسٹروک دیکھتا ہوں اور اس میں نئے اور پرانے اسٹروک سے علیحدہ مختلف اسٹروک تلاش کرتا ہوں۔

پھر یہ منظر میرے سامنے سے ہٹ گیا۔ میری بیوی دوبارہ گھر کے لباس میں آ گئی

تھی۔ اور وہ گھر میں ایسے ہی مصروف ہو گئی جیسے معمول کے مطابق رہتی تھی۔ اور میں کھانے کی میز پر، بستر پر اور اپنے اسٹوڈیو میں اس کو ایک غیر اہم چیز سمجھنے پر تل گیا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے اس مداح کے جانے کے بعد وہی سپاٹ صورتحال دیکھی، اس نے اس گرم جوشی کا جو وہ میرے مداح کے ساتھ دکھا رہی تھی اس کا بھی کوئی جواز پیش نہیں کیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو میں بھی اس منظر کو دھندلانے کے لیے دوسری تصویروں کے اسٹروک دیکھنے لگا۔

لیکن یہ بار بار ہونے لگا۔ میرے مداح کی آمد و رفت بڑھ گئی اور اس منظر میں مجھے ہر بار ایک نئی شدت نظر آئی۔ اب وہ میرے ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور اس طرح کے منظر میں نئے نئے اسٹروک......

میرے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو رہی تھی وہ بہت عجیب تھی۔ جب وہ مداح میرے گھر آتا، میں تمام وقت اسی کمرے میں رہتا، جہاں میری بیوی اس کی خاطر مدارات کرنے پر تلی ہوتی اس کی ایک ایک ادا ایک نئی سے نئی صورت حال کا انکشاف کرتی جاتی میں اس مداح کو نہال ہوتے ہوئے دیکھتا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے وہ مداح میں ہوں اور وہ میری بیوی نہیں ہے، کوئی اور عورت ہے۔ میری یہ کیفیت بڑھتی جا رہی تھی اس مداح کے جاتے ہی میں اپنی بیوی کو جھپٹ لیتا۔ میں اس سے کوئی باز پرس نہیں کرتا بلکہ اس رومانس کو مکمل کرنے کے لیے جو میری بیوی نے اس مداح سے شروع کیا ہوا تھا، اسے بستر پر لے جاتا اور اس کی تکمیل ایک عجیب انداز سے کرتا۔ اب یہ میرے لیے غیر اہم نہیں ہوتا۔ وہ بھی میرے لیے اس وقت میری بیوی نہیں ہوتی جیسے میں اپنی ضرورت کے تحت استعمال کرتا تھا۔ جو میرے لیے کھانا پکاتی تھی، میرے کپڑے دھوتی تھی اور میرے گھر کی اشیاء کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اب وہ کوئی اور عورت تھی۔ لیکن اس سے ہم بستری کے بعد یہ سب اچانک ختم بھی ہو جاتا۔ میں پھر وہی ہوتا اور وہی میری بیوی۔

اب مجھے اس کھیل میں مزا آنے لگا تھا۔ اب میں اس مداح کا انتظار بے چینی سے

کرتا۔ اور ان وقتوں میں جب وہ آنے والا ہوتا میں اپنے اسٹوڈیو سے باہر ہی رہتا جب وہ آتا تو میں دروازہ نہیں کھولتا۔ میں اپنی بیوی سے کھولنے کے لیے کہتا۔ وہ آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا اور اب میں سیدھا منہ اٹھا کر اس کے سامنے نہیں آتا بلکہ کچھ ایسے طریقے استعمال کرتا کہ چپکے چپکے اس کمرے تک جاؤں جہاں میری بیوی اس مداح کے سامنے مجھے اداؤں سے بھری کسی روپ میں نظر آتی، میں اس کی ہر ہر ادا پر تڑپ اٹھتا۔ میں یہ چھپ چھپ کر دیکھتا گویا وہ یہ سب میرے لیے کر رہی ہو۔ میں اپنے جسم میں اس کے لیے محبت کی لہر اٹھتی ہوئی پاتا۔ جو میرے لیے ایسی ہی ہوتی جیسے کسی غیر عورت کو اپنی طرف متوجہ کراتے ہوئے ہوتی تھی۔ میرا دل پھٹنے لگتا، جس میں محبت، خوشی، دکھ اور بہت کچھ ہوتا۔

یہ سب کچھ ایسے ہی تبدیل ہو رہا تھا جیسے کسی نئی تصویر کو بناتے ہوئے میں رنگ اور برش سے دیر تک کھیلتا تھا۔ لیکن اس تمام وقت میں یہ سارا کھیل اسی وقت شروع ہوتا، جب میرا مداح آتا۔ اور اسی طرح ختم ہوتا جب میں کھیل کی تکمیل بیوی کو بستر پر لے جا کر پوری کرتا۔ اور میری بیوی بھی بالکل ایسے ہی رہتی تھی جیسے وہ ہمیشہ رہتی۔

لیکن ایک دن جس دن میرے مداح کو آنا تھا مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں وقت پر پہنچ جاؤں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں سارے وقت اپنی بیوی اور مداح کے رومانس کو اس کی تمام تجلیوں کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اور اپنے جسم میں پھیلنے والی انجانی کیفیتوں کو محسوس کرتا رہا۔

گھر پہنچ کر میں نے بے چینی اور وارفتگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ میرے مداح نے کھولا۔ میں نے دیکھا میری بیوی اس کے پیچھے کھڑی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے میں باہر سے آنے والا کوئی اجنبی ہوں۔ میں نے تقریباً انہیں دھکا دیتے ہوئے خود کو اندر داخل کیا۔ اور دوڑ کر اپنے اسٹوڈیو کی طرف چلا گیا۔ اور اپنا سامان رکھ کر اپنے بستر کی طرف۔ میں نے اس مداح کی موجودگی میں اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ آج بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔ بہت اہم نظر آنے والی کوئی شے۔ وہ آئی اور دروازے کے پٹ پکڑ

کر کھڑی ہوگئی۔ میں جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی طرف بڑھا، "آؤ"۔ لیکن اس نے بستر کی طرف اور میری طرف ایسے دیکھا جیسے دونوں غیر اہم ہو چکے ہوں۔ میں نے اسے دوبارہ بلانے کی کوشش کی۔ میرا وجود پھٹا جا رہا تھا لیکن وہ پٹ چھوڑ کر چلی گئی۔ اور میرے مداح کی خاطر مدارات میں لگ گئی۔

لیٹے لیٹے میرے دماغ میں ایک عجیب احساس ابھرا۔ ایک نیا خیال، ایک ایسا شدید ریلا جس نے میری روح کو کچل دیا تھا۔ میں اپنی بیوی کو مداح کے گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اور خود کو اس مداح کی جگہ۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اور اپنے اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ اس دن میں نے اپنی بیوی کا یہ پورٹریٹ بنایا تھا اس دن وہ غیر اہم عورت بہت اہم نظر آ رہی تھی۔ پھر میں نے اپنا یہ فیصلہ دوسرے دن اپنی بیوی کو سنا دیا تھا۔

آج کل وہ میرے مداح کے ساتھ اس کی بیوی بن کر رہ رہی ہے۔ وہ دونوں اب اس شہر میں نہیں ہیں۔" اتنا کچھ کہہ کر آرٹسٹ اس پورٹریٹ کو دیکھنے لگا تھا۔

اور میں بھی بہت دیر تک آرٹسٹ کا بنایا ہوا وہ پورٹریٹ دیکھتا رہا۔ اور اس دن کی وہ کیفیت، جو آرٹسٹ نے اس کے چہرے سے اٹھا کر اس پورٹریٹ میں چھپائی تھی جو ایک بار دیکھنے کے بعد بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔

وہ ایک ایسی عورت کا چہرہ تھا جو پہلی بار اپنی رعنائیوں سے واقف ہونے کے بعد اس پورٹریٹ میں مسکرا رہی تھی۔

کایا پلٹ

ابھی ابھی وہ تیزی سے میرے کمرے میں گھسی تھی۔ ابھی ابھی، یعنی ایک گھنٹے پہلے۔ ایک گھنٹے پہلے، اس کی آنکھیں بجھی ہوئی تھیں اور ان میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ بلبلانے والے انداز میں میرے سامنے کھڑی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی، جو میں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی وہ مجھے چھوڑ گیا، وہ کیوں چھوڑ گیا، اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اس نے مجھے برباد کر دیا۔ وہ، وہ...... گالیاں اس کے منہ سے فراٹے سے نکل رہی تھیں۔ اور میں اپنے بھائی کو گالیاں کھاتے سن رہا تھا۔

کہانی میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ لیکن یہ عورت میرے لئے نئی تھی۔ بھائی نے ایسی کسی عورت کا ذکر مجھ سے نہیں کیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے اپنی بہت سی باتیں کرتا تھا۔ لیکن اب وہ چلا گیا تھا۔ یہ بھی صحیح تھا۔ اور اب شاید کبھی واپس نہ آئے۔ گھر والے اس کی واپسی کی امید نہیں رکھتے تھے۔

تھوڑی دیر تو میں اس عورت کے حملے سے پریشان رہا۔ یہ میرا آفس تھا، جہاں میں کام کرتا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ آدھے لوگ واپس آنے کے بہانے گھر جا چکے تھے اور آدھے آدھی چھٹی لے کر۔ میں اکیلے اپنا کام نبٹا رہا تھا۔ کام نبٹاتے ہوئے ابھی مجھے شاید کچھ منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ میں اپنی کرسی پر ستانے کی نیت سے بیٹھا ہی تھا جو اس دروازے کے سامنے رکھی ہے جو کوریڈور میں کھلتا ہے اور جہاں سے کوریڈور دور تک نظر آتا ہے۔ مجھے ایک لڑکی تیزی سے تقریباً بھاگتی ہوئی، کمرے کی جانب آتی نظر آئی۔ میں دور سے اسے دیکھ رہا تھا اور اتنی دیر میں، اس کا قد و قامت ناپ چکا تھا۔ وہ میرے سر پر پہنچ گئی اور شروع ہو گئی۔ وہ میرے بھائی کو برا بھلا کہہ رہی تھی اس کی آنکھوں سے پانی گر رہا تھا۔ اور میں سکتے کے عالم میں اسے اپنے قریب رکھے ٹیشو پیپرز بھی نہیں دے سکا تھا۔

یہ سلسلہ ختم ہوتے ہی، وہ ہلکے سے مسکرائی، ''لیکن میں آپ سے یہ سب کیوں کہہ رہی ہوں؟'' وہ کرسی پر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئی جو میرے سامنے رکھی تھی۔ ''ہاں''، میں چونکا ''آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ لیکن ٹھیک ہے، وہ میرا بھائی جو ہے۔ لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا کہ میں ہی اس کا بھائی ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے میں بھول گیا کہ میں اور میرا بھائی، دونوں قد کاٹھی، اور صورت شکل میں بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں لیکن پھر بھی، میری اور اس کی شکل میں کچھ فرق اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں اپنے اپنے نام سے پہچانے جائیں۔ بلکہ مجھے تو بعض دفعہ حیرت ہوتی تھی کہ ہمارے پسینے کی بدبو بھی بہت ملتی تھی۔ اس کے کپڑوں میں مجھے اکثر اپنے کپڑوں کی بو ملتی تھی۔

وہ عورت جو جوان تھی، اب اداس چہرہ بنائے ایک مخصوص انداز میں میرے سامنے کرسی پر بیٹھی جھول رہی تھی اور بالوں کی لٹ اس طرح اپنی انگلی میں گھما رہی تھی گویا اپنا سارا طوفان اس لٹ کے پیچ و خم میں گھما دے گی۔ میں نے قدرے تحمل سے اس سے پوچھا، ''آپ چائے یا......؟''

''نہیں کچھ نہیں، بس آپ مجھے جواب دیں۔ کیا اس نے مجھ پر ظلم نہیں کیا؟ کتنے وعدے کئے تھے اس نے، مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا''۔ یہ کہہ کر وہ پھر آنسوؤں سے رونے لگی۔ میں جو تھوڑی دیر پہلے اپنے بھائی کو گالیاں کھاتے سن کر کچھ غصے میں بھی تھا۔ اب اس کے آنسوؤں نے مجھ پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ اپنے بھائی کی

اخلاقی گراوٹوں پر غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ عورت سنبھلتی نہیں ہے تو اس کے قریب کیوں جاتے ہو۔ دور دور سے ہی دیکھو، جیسے اب میں دیکھتا ہی ہوں۔ میں نے کبھی کسی عورت سے دوستی نہیں کی۔ کیا فائدہ......

اس بار میں نے ٹیشو پیپرز اس کے ہاتھ میں پکڑانا شروع کر دیے۔ دیکھتے دیکھتے اس نے کئی ٹیشو پیپرز اپنے آنسوؤں سے پونچھ پونچھ کر پھینک دیے۔ لیکن آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور میں ان آنسوؤں میں پگھل رہا تھا۔ اور اندر ہی اندر بھائی کی ساری محبت غائب ہوتی جا رہی تھی۔ صرف اس کے خیال کے ساتھ جو بچا تھا وہ یہ کہ وہ انتہائی ظالم اور کمینہ ہے جس نے ایک عورت کی مٹی پلید کر دی۔

پتہ نہیں کب اس کے آنسو تھمے، اور وہ شکایتیں اور گالیاں جو وہ میرے بھائی کو دے رہی تھی۔ شاید پانی کا گلاس دیتے ہوئے، یا چائے بناتے ہوئے، کہیں سے ہماری گفتگو میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اس کے آنسوؤں میں بھی۔ اب بھائی زیر بحث نہیں تھا۔ وہ موسم، گندے پانی اور جانے کن کن باتوں پر گفتگو کر رہی تھی میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا دل بہل رہا تھا اور وہ اپنے غم کو بھلا بیٹھی تھی۔ میں خوش ہو رہا تھا۔ اگر یہ کچھ دیر اور بیٹھے تو شاید اپنا پورا غم بھول جائے۔ دوران گفتگو اب میں اسے بھائی کی طرف آنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے لگا جیسے وہ کئی بار میرے بھائی کا ذکر کر چکی ہے، لیکن اب دوسرے ڈھب میں ہے یعنی یہ کہ میری آنکھیں، میرے ہونٹ، میرے باتیں کرنے کا انداز، جو بھائی سے بہت ملتا جلتا ہے، دیکھ رہی ہے۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا، کیسے وہ اسے چھوڑ گیا؟ اتنی محبت اسے کہاں ملے گی۔ میں ابھی اس ملال میں ہی تھا کہ اچانک وہ کھڑی ہو گئی اور کرسی ہٹا کر میرے قریب آ گئی۔ ''میں تمہیں چھو کر دیکھنا چاہتی ہوں''۔ وہ میرے قریب آ گئی تھی۔ اور میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو چکا تھا اور اس کے اس حملے سے میں حواس باختہ ہو چلا تھا۔ ''کیا تم ایسے ہی محسوس ہو سکو گے جیسے تمہارا بھائی مجھے محسوس ہوتا تھا؟'' میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ وہ مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ اب وہ میرے بھائی کے نام سے مجھے پکار رہی تھی اور اس طرح چمٹ رہی تھی اور

مجھے چوم رہی تھی جیسے اس نے مجھے چھوڑا تو میں ہوا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔

میرے لیے اس کا جسم بھائی کی محبوبہ کا جسم ہی تھا۔ میں نے وہ ہمدردی جواب تک میرے دل میں قطرہ قطرہ جمع ہو رہی تھی، اچانک رحم میں تبدیل ہوتی ہوئی پائی۔ محبت کا جو طوفان اس کے دل میں میرے بھائی کے لیے تھا، میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینہ پانی کی طرح گر رہا تھا، اس کے ہاتھوں کی پوریں بہت ٹھنڈی تھیں جو میرے چہرے اور گردن کے گرد گھوم رہی تھی۔ پہلی بار کسی عورت کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی تھیں، جو میرے بھائی کی محبوبہ تھی۔ اس کی اس وارفتگی میں اب شدت پیدا ہو رہی تھی۔ میرا جسم اس کے پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، اس میں میرا پسینہ بھی شامل تھا۔ میرے کانوں میں بھائی کے نام کی گونج تھی۔ وہ مجھے بھائی کے نام سے پکار رہی تھی۔ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی چیختی ہوئی چیخوں میں۔

اب میرے اندر ایک اور تبدیلی پیدا ہو رہی تھی جو مجھے حیران کر رہی تھی۔ وہ جس سے چمٹ رہی تھی اب وہاں میرا بھائی ہی تھا۔ خود میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میں کب تحلیل ہو گیا تھا، مجھے نہیں پتہ۔ اس دوران وہ مجھے ایک چوزے کی طرح چیر پھاڑ کر کھا چکی تھی۔ میں اسے خود کو کھاتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکا، نہ جانے کب وہ میری کایا کلپ کر کے جا چکی تھی، اور میں اپنے بھائی کے نام کے ساتھ کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

تین ٹانگوں والی ریس

یہ ان داستانوں میں سے ایک داستان ہے جو فرضی نہیں ہے، جو میں لکھنے جا رہی ہوں اور جو میں لکھتی رہوں گی۔ مجھے یاد ہے وہ گلی، اور وہ ریت سے بھری سڑک جس پر ہم بہت سے بچے کھیلتے تھے۔ شام ہوتے ہوئے ہم اپنے اپنے گھروں سے نہا دھو کر نکلتے اور سڑک کے بیچوں بیچ جمع ہو جاتے۔ سب سے پہلے ایک دوسرے کے کپڑے دیکھتے۔ جس کے زیادہ اچھے نظر آتے یا جو اپنے کپڑوں میں زیادہ اچھا نظر آتا، ہم اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دیتے، پھر یہ بھی ہوتا کہ جو ہم میں سے زیادہ اچھا لگتا وہ اس دن بلا وجہ ہی سب سے زیادہ پکارا جاتا۔ ہم میں سے کوئی بھی جس کے ساتھ یہ سلوک ہوتا، وہ جان رہا ہوتا کہ آج وہ اچھا لگ رہا ہے، لہٰذا اکثر ہم سب کی یہ کوشش ہوتی کہ اچھے جوتے اور اچھے کپڑے پہن کر ہر شام گلی میں اترا کریں۔ یہ ہوتا رہتا۔ ہماری دوستیاں بھی گھٹتی اور بڑھتی رہتیں۔ ہمارے کھیل روز نئے نئے ہوتے اور ہم بہت سے کھیل کھیلتے ہوئے اکثر یہ بھول جاتے کہ ہم میں سے آج کا ہیرو کون ہے۔ اکثر گھروں کو واپس جاتے ہوئے ہم اتنے صاف نہیں رہتے۔ لیکن جو صفائی یا اچھے لگنے کے نمبر پہلے لے جاتا وہ آنکھوں ہی میں داد لیتا رہتا۔

اس دن بھی ہم کوئی کھیل کھیل رہے تھے کہ ہم میں سے ایک جواب تک نہیں آیا تھا، ہمیں اپنے گھر کے دروازے سے باہر آتا نظر آیا۔ ابھی تک ہم اس فیصلے پر نہیں پہنچے تھے کہ کون آج کا ہیرو ہے۔ وہ درمیان کے گھروں سے نکل کر آنے والی رانو تھی۔ اس کی آنکھیں سُرمے سے بھری ہوئی تھیں اور بال سرخ ربن سے بندھے تھے اور سفید موزے اس کے گھٹنوں سے اوپر چڑھے تھے۔ اس کے جوتے بالکل نئے اور کالے تھے۔ ہم سب نے جو ابھی سر جوڑے کسی کھیل کے ابتدائی حصے کے بارے میں سوچ رہے تھے، اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کے بال، جو اس کی ماں نے یا اس کی پھوپھی نے باندھے ہوں گے، جیسا کہ ہم سب کے کوئی نہ کوئی گھر میں باندھتا تھا، گول گول لہراتے ہوئے اس کے بازوؤں سے ہوتے ہوئے شانوں کے نیچے سے بھی آگے آ رہے تھے اور وہ ہمیں اپنی کہانیوں میں پڑھنے والی یا سنائی جانے والی کوئی ننھی پری نظر آ رہی تھی۔ سب بھرّا مار کر اس کی طرف بڑھے۔ میں بھی اس کی طرف بڑھی، مجھے بھی وہ اچھی لگی تھی۔ حالانکہ مجھے صبح سے، چونکہ آج چھٹی کا دن تھا، لہٰذا خوب جم کر خود کو تیار کرنے کی مہلت ملی تھی۔ میں نے خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا تھا، اور اپنی بڑی بہن سے اپنے گھنگھریالے اور نہ سنبھلنے والے بالوں کی کس کس کر چوٹیاں بنوائیں تھیں۔ جن کو باندھتے ہوئے میری بہن نے میرے سر میں کئی دھپیں لگائیں تھیں۔ مجھے اپنا سرخ رنگ برا لگتا تھا۔ اگر میرے چہرے پر سُرخی نہیں ہوتی تو میں بھی رانو کی طرح گوری ہوتی لیکن میں تو گوری ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور سرخ اینٹ کی طرح اکثر نظر آتی تھی۔ لیکن خیر، آج رانو نمبر لے گئی تھی اور اب سب رانو کے گرد جمع تھے۔ رانو کے اسکول میں آج کھیل کا دن تھا اور اس میں وہ ایک نیا کھیل سیکھ کر آئی تھی۔ ہم سب غور سے اسے دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے۔ ایک لڑکا ایک لڑکی، ایک لڑکا ایک لڑکی۔ اس نے سب کی جوڑی بنادی تھی جس میں ایک لڑکے کی اور ایک لڑکی کی ٹانگ ایک دوسرے سے باندھ کر دوڑ لگائی جائے گی۔ جو آگے نکل جائے گا وہ ہارے ہوؤں کی پیٹھ پر سواری کرے گا، یا پھر دوسرے دن اپنی پاکٹ منی سے، جو اسکول جاتے ہوئے ملتی ہے، ٹافیاں کھلائے گا۔ یہ طے ہوا اور جوڑے بن گئے

اور دوڑ شروع ہوگئی۔ میری جوڑی، سبز آنکھوں والے رحیم کے ساتھ بنی تھی۔ رحیم دبلا پتلا، لمبی گردن والا اور ملگجی سی جلد والا، رانو کا بھائی تھا۔

وہ اپنا ساتھی مجھے بنتا دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا بھی تھا۔ میں بھی مسکرادی تھی۔ فیصلہ رانو نے کیا تھا جو سب کو آج اچھی لگی تھی۔ لیکن جب دوڑ شروع ہوئی تو میں اور رانو کا بھائی ہر بار جیتے۔ میں بھی رانو کے بھائی کی طرح لمبی، پتلی اور سرخ جلد والی تھی۔ اس کھیل میں بہت مزہ آتا۔ اب اکثر یہ کھیل کھیلا جاتا۔ یہ جوڑی ایک دوسرے کے نام سے پکاری جاتی، بلکہ اب تو ہر کھیل میں رانو کا بھائی میرا پارٹنر بنتا۔ یوں بھی ہوتا جب ہم بچوں کا کھیلنے کو دل نہیں چاہتا تو جوڑیوں میں اسی طرح بٹ جاتے جس طرح پہلے دن بٹے تھے۔ اور اِدھر اُدھر کی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے۔

ایک شام جب ایسے ہی ڈھلے دھلائے ہم سب اپنے گھروں سے نکلے تھے اور جوڑیوں میں بٹے آج پھر وہی تین ٹانگوں والی ریس کھیلنے کی تیاریاں کررہے تھے کہ سڑک میں ایک لال گاڑی داخل ہوئی اور وہ بالکل ہم لوگوں کے سامنے آکر رک گئی۔ پچھلے دروازے سے ایک پیلے رنگ کی گھیر دار فراک جس میں اندر چنٹ دار بکرم نے اسے اور پھلا دیا تھا، پہنے ہوئے ایک لڑکی تیزی سے نکلی اور ہمارے بیچ آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف مجھے گھورتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور میرے سینے پر ہاتھ مار کر اس نے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں زمین پر پیچھے کی طرف جا پڑی۔ اور ریت میں لت پت ہوگئی۔ اس نے اسی تیزی سے وہ رسی، جو ابھی رانو کے بھائی کے ہاتھ میں اس ارادے سے تھی کہ وہ میری اور اپنی ٹانگ باندھتا، اس کے ہاتھ سے کھینچ کر خود اپنی ٹانگ رانو کے بھائی کی ٹانگ سے باندھ لی۔ میں حیران زمین پر پڑی یہ سب دیکھ رہی تھی اور سارے بچے دم بخود اس کی اس حرکت پر مجھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے دھکا دینے والی لڑکی، جو پیلے فراک اور پیلے چمکیلے جوتوں میں تھی اور رانو کی طرح نیلی آنکھوں والی تھی، لیکن جس کی جلد رانو سے زیادہ سفید تھی، پھولوں والا ہیر بینڈ لگائے ہوئے سب کو اپنی اس حرکت کے باوجود اچھی اور نئی لگ رہی تھی۔ میں بھی سب کی آنکھوں میں

پسندیدگی دیکھتے ہوئے اس شام کی سب سے اچھی لگنے والی لڑکی کی طرف دھکا کھانے کے باوجود خود کو جھاڑ پونچھ کر بڑھی۔ رانو نے سب کو بتایا کہ وہ اس کی پھوپھی زاد ہے اور رانو کا بھائی اس کے ہوتے ہوئے کسی کا پارٹنر نہیں بن سکتا۔ میں موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ایک طرف کو ہوگئی تھی۔ اور کسی اور کے ساتھ تین ٹانگوں والی ریس کھیلنے میں جٹ گئی تھی۔

یہ تو وہ دن تھے جب ہم سب اس گلی میں چھوٹے تھے اور پھر بغیر دن اور رات گنے ایک ایک کر کے بڑے ہوتے گئے اور اس بڑے ہونے کے دوران یہ بھی جانتے گئے کہ پارٹنر کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لیکن ہم سب کو شاید وہ لڑکی کبھی نہیں بھولی جس نے ایک شام مجھے دھکا دیا تھا اور رانو کے بھائی کو اپنا پارٹنر بنایا تھا۔

رانو کی پھوپھی زاد دوسرے شہر میں رہتی تھی اور کبھی کبھی ہمارے کھیلوں میں شریک ہوتی تھی۔ وہ جب آتی، اکثر مجھ سے لڑنے پر تلی ہوتی اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ اس کے نہ ہوتے ہوئے میں رانو کے بھائی کی پارٹنر بن جاتی ہوں۔ ہمارے وہ کھیل اگرچہ اب ختم ہو چکے تھے لیکن اب بھی کبھی اسکول یا کالج جاتے ہوئے اس سڑک کو پار کرتے ہوئے جب ہماری ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہوتی اور جو اچھا لگ رہا ہوتا اس پر ویسے ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں پسندیدگی کی نگاہ ڈالتے اور داد دے رہے ہوتے۔

اب بے پناہ کتابوں کی پڑھائی نے ہمیں کبھی جمع ہونے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب کوئی ہیرو نہیں بن سکتا تھا۔ وقت بھی بہت سا گزر گیا تھا۔ پھر تو یہ بھی پتہ نہیں چل سکا، کون کہاں گیا۔ اب بس یہ ہوتا کہ اس سڑک پر کسی گھر میں کسی شادی بیاہ میں جب جمع ہوتے، تو ایک دوسرے کو پہچان کر ہنس دیتے۔

ایسی ہی کسی شادی میں مجھے پتہ چلا تھا کہ رانو کی پھوپھی زاد کی شادی ہوگئی۔ رانو کی پھوپھی زاد، رانو کے بھائی کو اپنی زندگی کا پارٹنر بنانا چاہتی تھی، لیکن رانو کی ماں اور اس کی ماں کے درمیان ہمیشہ کی ان بن نے رانو کی پھوپھی زاد کو کہیں دور دیس بھیج دیا۔ جہاں رانو کی پھوپھی زاد کلس کلس کر زندگی گزارنے لگی۔ رانو کا بھائی، اب چوڑا چکلا،

تانبے کے برتن جیسے گول منہ والا، مجھے اکثر سڑک سے گزرتے ہوئے نظر آتا وہ جب مجھے ملتا، میرا دل اندر ہی اندر کھولنے لگتا۔ لیکن رانو جب مجھے کبھی سڑک پر ملتی تو اپنی پھوپھی زاد کے بارے میں ضرور بتاتی، جس کے لیے اس کے بھائی نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اور اس کے تڑپنے کے باوجود اسے دوسری جگہ بیاہتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

پھر ایک دن رانو سے پتہ چلا رانو کی پھوپھی زاد بھاگ کر آ گئی تھی۔ وہ اپنے اس شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی جس کے ساتھ زبردستی باندھ دی گئی تھی۔ ''شاید بھائی نے اسے کوئی امید ضرور دلائی تھی، ورنہ وہ......''

''ورنہ کیا؟'' میں نے دھیمے حیرت سے پوچھا۔

''ورنہ وہ اپنے شوہر سے طلاق نہیں مانگتی۔ اس کے تین بچے بھی ہو گئے تھے''۔

''پھر!''

''پھر کیا گھر والے سب اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ لیکن ایک رات جب بھائی بھی گھر والوں کی طرف ہو گیا۔ اس رات میری پھوپھی زاد نے زہر کھا لیا''۔

''کیا؟'' میری حیرت اب چیخ رہی تھی۔

''ہاں، یا شاید سب نے مل کر''۔ رانو روتی ہوئی اب اپنے راستے پر چل پڑی تھی۔ اور میں اس کی پیٹھ جھٹ پٹے میں غائب ہوتے ہوتے دیکھتی رہی۔

ایک شام جب میں گھر سے باہر کھڑی اس سڑک پر ننھے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پھر میں ان بچوں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں ان سے پوچھ رہی تھی، ''تم تین ٹانگوں والی ریس کھیلتے ہو؟''

وہ پوچھ رہے تھے ''تین ٹانگوں والی ریس کیا ہوتی ہے؟'' اور میں خوش ہو رہی تھی۔ یہ ابھی تک تین ٹانگوں والی ریس کے بارے میں نہیں جانتے......

گولڈن ایج

لڑکی کی عمر سولہ سال ہے اور لڑکے کی لگ بھگ پچیس یا چھبیس سال۔ لڑکی بھولی بھالی ہے اور لڑکا امیری میں رہنے والی عیش و آرام میں تجربہ کار اور سیانا۔

دونوں ایک گاڑی میں بیٹھے ہیں جو شہر سے دور سمندر کی طرف انہیں لے جا رہی ہے، جہاں لڑکے کی ہٹ ہے لڑکا اپنی گاڑی میں، اپنے ارادے کے مطابق لڑکی کو لے جا رہا ہے، لڑکی فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی کی ہوا سے محظوظ ہو رہی ہے اور دور تک نیچے اوپر ہونے والی سڑک کو دیکھ رہی ہے۔ کبھی کبھی وہ ہوا کو اپنے چہرے پر اور زیادہ چھونے کے لیے اپنا چہرہ گاڑی سے باہر نکال لیتی ہے۔ لڑکا کن انکھیوں سے لڑکی کے کھلکھلاتے چہرے کو دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے۔ کیا یہ اتنی ہی بے وقوف ہے؟ اس کے برابر ایک خوبصورت جوان لڑکا بیٹھا ہوا ہے، جو اُسے اتنی شاندار گاڑی میں گھمانے لے جا رہا ہے، یہ مجھے دیکھتی بھی نہیں۔ لیکن لڑکی اسی وقت لڑکے کو دیکھتی ہے اور اس کے ابھرے ہوئے ہونٹوں کے کونے پر موٹے سے تل کو گھورتے ہوئے سوچتی ہے، یہ مصنوعی سا لگ رہا ہے۔ لڑکا، لڑکی کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں پر چڑھے سیاہ چشمے کے پیچھے گول سی خوبصورت ناک کو سکیڑ کر مسکراتا ہے۔ لڑکی سوچتی ہے اس نے چشمہ کیوں لگایا ہوا ہے،

دھوپ تو اتر چکی ہے۔ اب تو سنہری سی شام ہے۔

لڑکی پھر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ لڑکا اسے آواز دیتا ہے۔ وہ اس کا نام لے کر پکارتا ہے۔ فرانے بھرتی ہوا، لڑکی کے کانوں میں بہت سی آوازیں بھر دیتی ہے۔ وہ لڑکے کی آواز کو دور سے آتا ہوا سنتی ہے اور اسے یوں دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو، پکارا؟

لڑکا اس کے کان کی طرف منہ کر کے کہتا ہے "تمہاری عمر کیا ہے؟"

عمر؟ لڑکی حساب لگاتی ہے، ابھی تو وہ گیارہویں کلاس میں آئی ہے اور دل ہی دل میں اپنی عمر کا تعین کر کے بتاتی ہے۔ "سولہ سال۔"

کیا؟ لڑکے کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکنے لگتے ہیں۔

وہ زور سے چلاتی ہے "سولہ سال"۔

لڑکا گاڑی کو بریک لگا کر روک دیتا ہے، "تم سولہ سال کی ہو؟"

"ہاں، ہوں، میں غلط نہیں کہہ رہی۔" وہ ڈر جاتی ہے۔

لڑکا سوچ رہا ہے۔ ابھی تک جتنی لڑکیاں اس کے حصے میں آئی تھیں، وہ سولہ سال کی نہیں تھیں، وہ اپنی یہ گولڈن ایج گزار کر اس تک پہنچی تھیں۔ لیکن شاید اس کو نہیں پتہ یہ کتنی بیش قیمت عمر ہے۔ "تم جانتی ہونا" وہ اس کے بالوں کی پونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"کیا؟"

"تم انتہائی قیمتی سال میں ہو"۔

"قیمتی سال، وہ کیا ہوتا ہے؟" لڑکی وقت کے ضائع ہونے پر پریشان ہے۔

"اب چلو بھی" وہ الجھ کر کہتی ہے۔

"ہاں چلو"۔ لڑکا دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے۔ وہ گنگناتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے۔ لڑکی حیران ہے۔ یہ میری عمر بتانے پر اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے۔ عجیب ہے، کتنا مزہ آ رہا تھا۔ گاڑی کتنی اسپیڈ سے چلاتا ہے۔

"لیکن اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟" لڑکی پوچھتی ہے۔

"میں تمہیں بہت دور لے جا رہا ہوں، بہت خوبصورت جگہ، لیکن تمہاری عمر سے زیادہ خوبصورت نہیں"۔

لڑکی سوچتی ہے، کیا بک رہا ہے، خوبصورت عمر۔ پاگل ہے۔ ایسا کیا ہو گیا ہے میری عمر میں۔ ابھی تک تو کوئی بھی حیران نہیں ہوا تھا۔ وہ کتنے دنوں سے سولہ سال میں ہے۔ ماں بھی جو سلوک سب کے ساتھ کرتی، وہی میرے ساتھ کرتی ہے۔ کسی نے میری اس عمر کو سلیبریٹ نہیں کیا۔ پھر ایسے کیا ہو گیا۔

لڑکا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے "سنو، شیشے چڑھا لو"۔

"کیوں؟" وہ باہر منہ نکال کر دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

لڑکا گاڑی اور تیز کر چکا ہے۔ اور لڑکی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے، ہوا میں، بادلوں میں۔ برابر میں بیٹھے لڑکے کو وہ کبھی کبھی دیکھ لیتی ہے جو بہت خوبصورت ہے، بہت اچھے کپڑے پہنے ہے اور بہت اچھا پرفیوم لگائے ہوئے ہے جس کی مہک ہوا کی خوشبو کے ساتھ مل کر اس کی ناک میں پہنچ رہی ہے۔ لڑکا پھر اس سے کہتا ہے، "شیشے چڑھا لو۔"

"لیکن کیوں؟"

لڑکا اس کے ادھ کھلے بازوؤں کی طرف دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے "تمہارے بازو بہت خوبصورت ہیں۔" لڑکی باہر ہوا میں اڑتے پرندوں کی ڈار کو جو ابھی ابھی گاڑی کے سامنے سے گزری تھی، دیکھتی ہے اور پھر اپنے بازو دیکھتی ہے۔ لڑکے کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسے اچانک وہ آنکھیں بھی ایسے ہی اچھی لگتی ہیں جیسے پرندے ابھی اڑتے ہوئے اسے اچھے لگے تھے۔

شیشے چڑھا کر وہ اسے مسکرا کر دیکھتا ہے۔ وہ بھی مسکرا دیتی ہے۔ اور سوچتی ہے، یہ مسکراتا ہوا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ لڑکا مسکراتے ہوئے سوچتا ہے، نہ جانے کیا سوچ کر مسکرا رہی ہے، میں نے کوشش تو کی ہے کہ میرا جسم اس کے جسم کو چھو جائے۔ لڑکی بند گاڑی میں اب بیٹھ گئی ہے اور اب صرف لڑکے کے بارے میں سوچ رہی ہے جو بار بار

اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔

اچانک لڑکا لڑکی سے سوال کرتا ہے، ''تم اس سے پہلے کبھی سمندر پر گئی ہو۔''

''ہاں، اتنی دور تو ایک بار کالج کے ساتھ پکنک منانے گئی ہوں۔''

''سمندر کیسا لگتا ہے؟'' لڑکا اس کی طرف جھک کر اس طرح پوچھتا ہے۔ جیسے سمندر کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے بارے میں پوچھ رہا ہو کہ میں کیسا لگ رہا ہوں۔

لڑکی اور سمٹ کر سوچتے ہوئے کہتی ہے، ''بہت اچھا''۔ اچھا کہتے ہوئے وہ یاد کرنے لگتی ہے وہ سمندر جو اس نے کالج کے ساتھ پکنک مناتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ منظر آنکھوں میں بھرنے لگتی ہے اور لڑکا سوچ رہا ہے یہ کتنی شاندار عمر میں ہے، اُف۔ دونوں کے منھ سے ایک ساتھ اُف کی آواز نکلتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ دونوں ہنسنے لگتے ہیں۔

''کیوں ہنسیں؟'' لڑکا ایک بار پھر اس کی طرف قدرے جھک کر پوچھتا ہے۔

''تم نے اور میں نے ایک ساتھ اُف کی آواز منہ سے نکالی۔'' وہ ہنستے ہوئے کہتی ہے اور لڑکا تاسف سے سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے کیسے بتایا جائے، یہ مجھے اتنے خوبصورت جوان کو اس بند گاڑی میں ذرا محسوس نہیں کر رہی ہے۔ اور لڑکی سوچ رہی ہے۔ چشمہ اس کے چہرے پر اچھا لگ رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کہتی ہے، ''چشمہ تم پر اچھا لگ رہا ہے۔''

لڑکا گاڑی اور تیز کر دیتا ہے کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ لڑکی کے چہرے پر اپنی خوبصورت آنکھیں ٹکا کر پوچھتا ہے۔

''اچھا۔ بہت اچھا۔ ایسی ہی لانگ ڈرائیو پر جانے کے لیے میرا دل ہمیشہ چاہتا تھا۔ دیر تک گاڑی ایسے ہی اکیلی سڑک پر تیز چلا کرے۔''

لڑکا دل ہی دل میں بھیجنے لگتا ہے وہ اپنے ہاتھ کو لڑکی کے کندھے پر رکھنا چاہتا ہے۔ لڑکی کندھا ذرا دور سرکا دیتی ہے۔ لڑکے کا ہاتھ گر جاتا ہے۔ لڑکا گرے ہوئے ہاتھ سے دوبارہ اسٹیرنگ پکڑ لیتا ہے۔

''تم اسٹیرنگ پکڑنے کے بجائے میرا کندھا پکڑ رہے تھے''۔ لڑکے کو اچنبھو سا لگ جاتا ہے۔

وہ گاڑی روک دیتا ہے۔ ''تم سمندر پر میرے ساتھ کیوں جا رہی ہو؟''

''گھومنے۔'' لڑکی کندھے اچکا کر باہر دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔ لیکن دل ہی دل میں بے زاری ہوتی ہے۔

''صرف گھومنے؟'' اپنی توقعات کو چکنا چور ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔

''ہاں صرف گھومنے۔ تم نے مجھ سے یہی تو کہا تھا۔ ہم ایک دن سمندر پر گھومنے چلیں گے''۔

''ہوں''۔ لڑکا بہت غور سے لڑکی کے بھولے بھالے سپاٹ چہرے کو دیکھتا ہے۔ گرچہ جواب سن کر اس کا دل بجھنے لگتا ہے۔

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' لڑکی اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھتی ہے۔

''ٹھیک ہے، چلو ہم سمندر کے کنارے گھومنے ہی تو جا رہے ہیں''۔

''چلو'' گاڑی شور مچا کر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ اور پہلے سے زیادہ تیز رفتار ہو جاتی ہے۔

لڑکی اب چپ سادھے بیٹھی ہے۔ اور سوچ رہی ہے یہ بار بار کیوں یہ سوال کر رہا ہے، ہم صرف گھومنے جا رہے ہیں۔ خود لے کر آیا ہے، پہلے سے طے تھا کہ ہم گھومنے جا رہے ہیں۔

اسے لڑکے سے اپنی پہلی ملاقات یاد آتی ہے۔ وہ اس کی دوست کا دوست تھا۔ اور پہلی ملاقات میں ہی لڑکا یہ طے کر رہا تھا کہ وہ سمندر کے کنارے جائیں گے۔ لڑکی سمندر کی ہمیشہ کی دیوانی، بے سوچے سمجھے حامی بھر رہی تھی۔ اور پھر وہ دن آن پہنچا تھا جو پہلے سے طے تھا۔ میں سمندر پر اس کی گاڑی میں گھومنے جا رہی ہوں جو میری دوست کا دوست ہے۔ وہ کبھی گاڑی میں سمندر پر شہر سے دور نہیں گئی تھی۔ اور پھر اکیلے۔ اس

لڑکے کے ساتھ۔ اس کی سوچیں گاڑی میں بدلتے ہوئے گیئرز کی طرح آگے پیچھے ہونے لگیں۔ اس نے ایک اُچٹتی سی نگاہ لڑکے پر ڈالی۔ لڑکا کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہے۔ اس نے دل ہی دل میں لڑکے کی خوبصورتی کی داد دی، اسے یہ خیال بہت عجیب سا لگا۔

لڑکا اس سے پہلے بے شمار بار لانگ ڈرائیو پر بے شمار گرل فرینڈز کے ساتھ گھوما تھا۔ وہ ایسے مدہوش کر دینے والے لمحوں سے کئی بار گزر چکا تھا۔ جس میں اس کی پارٹنر ہر عمر کی لڑکی ہوتی، جو اس کے ساتھ جنسی طور پر لطف اٹھانے پر بھی تل جاتی، اس کے ہر اشارے پر لبیک کہتی۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے پلٹ کر لڑکی کو دیکھا جو باہر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ میں نے غلط تو نہیں کیا۔ صرف سمندر گھومنے کے لیے میں اتنی دور اس لڑکے کے ساتھ آ گئی۔ اور اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کا سارا منظر بدل گیا۔ وہ بجھنے سا لگا۔ اب نہ وہ پیڑوں کو دیکھ رہی تھی اور نہ اپنے پیچھے گزرتی ہوئی سڑک کو۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے لڑکے کی جانب دیکھا اور پوچھا:

''میں شیشہ کھول لوں؟''

''ہاں جی، کھول لیں''۔ لڑکے نے نہ جانے کیوں لہک کر اسے جواب دیا۔ لڑکی خوش ہونے کے بجائے کھسیانی سی ہو کر بیٹھ گئی۔

ذرا سی کھلی کھڑکی سے گھسنے والی ہوا نے اسے پھر اپنے ساتھ دوڑنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اب وہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے بھی اور تیز ہوا کو اپنے چہرے پر تڑاتڑ پڑتے ہوئے بھی گاڑی کے اندر کی فضا میں دبک سی رہی تھی۔

لڑکا سوچ رہا تھا۔ اس تبدیلی پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیا ڈر گئی یا یہ میرے وجود سے واقف ہو گئی ہے؟ ابھی کتنی غافل بیٹھی تھی، جیسے میں ہوں ہی نہیں۔ صرف گاڑی اسے بھگائے لئے جا رہی ہے۔

اور پھر لڑکے کی منزل آ گئی۔ گاڑی رک گئی۔ وہ پانی کی بوتل گاڑی کی پچھلی سیٹ سے نکالنے کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ اور اپنے جسم کے بوجھ کو بہت ہلکے سے لڑکی کے جسم سے ٹکراتا ہے۔ لڑکی دروازہ کھولنے کے ارادے سے مڑنا چاہتی ہے اور اس بوجھ

سے بچنا چاہتی ہے لیکن وہ ناکام رہتی ہے۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھولنا چاہتے ہوئے بھی نہیں کھول پاتی۔ لڑکے کے جسم کی خوشبو اس کے نتھنوں سے اس کے دماغ میں داخل ہوتی ہے۔ اور اب تو ویسے بھی گاڑی رک چکی تھی۔ سامنے سے سمندر کی نمکین ہوا سمندر کے پانی کی آواز کے ساتھ اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ لڑکے نے بوتل اٹھانے میں وقفہ لیا تھا۔ اور جس ہاتھ سے لڑکی کو دروازہ کھولنا تھا وہ ہینڈل کے ساتھ چپکا ہی رہ گیا تھا۔

لڑکا پانی کی بوتل اور ہینڈ بیگ لے کر اترتا ہے۔ وہ اسے اترتے ہوئے ایسے دیکھتی ہے جیسے پچھلا لمبا سفر اس نے اس کے ساتھ طے ہی نہیں کیا ہو۔ پھر وہ اپنے لیے دروازہ کھولتے ہوئے دیکھتی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتی ہے۔ اور سوچتی ہے یہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ اچانک سب تبدیل کیوں ہو گیا۔ ابھی تو وہ ہوا کے ساتھ اُڑی جا رہی تھی۔

لڑکا تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ اس ریت کو جو اس کے جوتوں میں گھس رہی تھی اور اس کے تلوؤں میں گدگدی کر رہی تھی وہ اس سے محظوظ ہونے لگی۔ لڑکا ایک بار پھر سمندر کی طرف بڑھتے ہوئے الجھنوں میں پڑ رہا تھا، اب ریت سے خوش ہو رہی ہے۔ اس کو میں بالکل نظر نہیں آ رہا۔ لڑکیاں اس کے ساتھ یہ وقت گزارنے کے لیے ترستی ہیں۔ اس کے ساتھ یہاں آنے کے کیسے کیسے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔ اسے کیسے کیسے رجھاتی ہیں۔ وہ کسی کو ٹال دیتا ہے، اور کبھی مزے لیتا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ لڑکی ایک مرے ہوئے کیکڑے کو اپنے ہاتھ میں پکڑے اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ ''میں نے ریت سے، ایک مرا ہوا کیکڑا پکڑا ہے''۔

''لعنت!'' اس نے اس کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔ ''ہوں، میں تمھیں یہاں اتنی دور اسی لئے تو لایا ہوں کہ تم مرے ہوئے کیکڑے سے کھیلو۔''

لڑکی کیکڑے کی موت کی ذمہ دار ان گاڑیوں کو ٹھہرا رہی تھی، جو یہاں بے دھڑک ان کی دنیا میں چلی آتی ہیں۔ لڑکا ایک بار پھر تاسف سے اسے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا

ہے۔ اور وہ لڑکے اور اپنے درمیان دوستی کے موہوم سے دھاگے کو ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اور سوچ رہی ہے، ماں سچ کہتی تھی میں ہر کام بے سوچے سمجھے کرتی ہوں۔ بالکل بے وقوف ہوں۔

لڑکے کی ایک اور منزل آ گئی۔ وہ اپنی ہٹ کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ لڑکی تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی لیکن پھر کمرے کے باہر ورانڈے کی چھوٹی سے بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ اب سمندر دیکھنے لگی۔ جو غرا غرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ دور سے اس کی موجیں وہیل مچھلیوں کی طرح تلے اوپر لدی ہوئی آتیں اور ساحل پر آ کر ایسے گرتیں، جیسے اسے کچا کھا جائیں گی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ میں نے ساری رات اس سمندر پر گھومنے اور پانی سے کھیلنے کا خواب دیکھا تھا۔ یہ سمندر اب کیسا لگ رہا ہے۔ سارا مزا یہاں پہنچ کر نہ جانے کیوں اس ریت کی طرح کرکرا ہو گیا جو ہوا کے ساتھ نہ جانے کب اڑ کر اس کے ہونٹوں سے چپک گئی تھی۔ وہ بینچ پر بیٹھی رہی۔

لڑکا ہٹ میں جا کر واپس نہیں آیا تھا اس نے ساحل پر دیکھا۔ وہاں کچھ بچے اور عورتیں ایک دوسرے پر پانی پھینکتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ بھی ساحل پر ایسے ہی دوڑنا چاہتی تھی۔ نہ جانے یہ لڑکا کہاں چلا گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ لڑکے نے کمرے کے دروازے سے سر نکال کر اس سے کہا، ''آؤ فریش ہو جاؤ۔''

''فریش تو ہوں، گھر سے منہ دھو کر چلی تھی''۔

لڑکا اس کا جواب سن کر اس بینچ پر اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کھسکنا چاہا۔ لیکن بینچ ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکے سے جڑی بیٹھی رہی۔ لڑکے کی پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔ اس نے بوتل منہ سے لگائی اور غٹ غٹ پیتی چلی گئی۔ لڑکا ایک بار پھر تلملا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کی بے ساختہ حرکتیں اس کے اندر الجھن کے ساتھ ایک عجیب نئی سی خوشی بھی چھوڑ جاتی تھیں جن سے وہ پہلی بار دوچار ہو رہا تھا۔

لڑکی سوچ رہی ہے، اسے لڑکے سے جڑ کر بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ اگر یہ کچھ ہٹ کر

بیٹھتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ سامنے سے گزرنے والے لوگ بلاوجہ ہمیں دیکھنے لگے ہیں۔ اسے یاد آیا، ایک فلم میں، ہیرو، ہیروئن سے جڑا بیٹھا تھا اور...... وہ یاد کرتے ہی جھٹکے سے اٹھی اور ہٹ کی بالکونی کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکا خوش ہو گیا۔ تم کو آخر میرے جسم نے جگا ہی دیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں۔ مجھے یاد آ گیا''۔

''کیا؟'' لڑکا منہ کھولے کسی حیران کن جواب کے انتظار میں بھی تھا۔

''یہی کہ ہم کوئی ہیرو ہیروئن تو نہیں ہیں جو یوں سب کے سامنے جڑ کر بیٹھ جائیں۔''

لڑکا دل ہی دل میں اپنا سر پیٹ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ خاموش رہا۔ اور تھوڑی دیر بینچ پر بیٹھے رہنے کے بعد دوبارہ ہٹ میں چلا گیا۔

لڑکی دوبارہ بینچ پر بیٹھ کر ساحل کی طرف دیکھنے لگی جہاں اب بہت سے لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ وہ انہیں حسرت سے دیکھنے لگی۔ میں بھی تو یہاں یہی سب کچھ کرنے آئی تھی۔ لیکن یہ...... وہ اس لڑکے کے بارے میں سوچنے لگی جو ابھی اس کو آنکھیں پھاڑے گھورتا ہوا، اندر گیا تھا۔ نہ جانے کیسی خفیہ خفیہ سی حرکتیں کر رہا ہے۔ اور یہ سوچتے ہوئے انجانے خوف کی جھرجھری سی اس کے بدن میں اٹھی۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ لیکن پھر ان لڑکوں کی طرف اس کی نظر چلی گئی۔ وہ پھر ان کے کھیل میں گم ہو گئی۔

لڑکا اب شاید آخری وار کے لیے تیار ہو کر آ گیا تھا۔ اس نے سوئمنگ کاسٹیوم پہن رکھا تھا۔ اس کا سفید چمکیلا بدن سرخ کاسٹیوم میں ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی وہ پانی میں رہنے والی جل پریوں سے کھیلتا ہوا باہر آیا ہو۔ اور اب اس کے سامنے کھڑا ہے۔ لڑکی نے آنکھیں جھپک جھپک کر اسے دیکھا۔ اس کی سفید دودھیا رانوں پر سنہرے بال اور کسی ہوئی پنڈلیاں، اوپر سے نیچے تک وہ ایک نظر ڈال کر ٹکر ٹکر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اب یہ کیا چاہتا ہے؟ اس کے اس طرح دیکھنے سے لڑکے کے رگ و پے میں بجلیاں

کوندگئیں۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن ساتھ ہی ساتھ، اس کی آواز بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ اس نے اس کے جسم کو ساکت کر دیا۔

لڑکی کہہ رہی تھی، ''تم نے یہ کیا پہن لیا؟ تمہیں نہانا تو نہیں ہے۔ اور پھر یہ بچوں جیسے کپڑے!'' ہنسی اس کے منہ سے پھوٹ پڑی تھی اور وہ ہنس رہی تھی۔ لڑکا تھوڑی دیر اس کی ہنسی کو دیکھتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کے کانوں سے دھواں نکل رہا ہو۔ وہ تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔ اور لڑکی اس کے حلیے کو یاد کر کے ہنستی رہتی۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر فٹ بال کھیلتے ہوئے لڑکوں نے فٹ بال اس کی طرف اُچکا دی۔ اس نے فٹ بال کو زمین پر گرنے نہیں دیا اور اُچک کر اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اب وہ ان لڑکوں کے ساتھ ریت پر لوٹ لوٹ کر فٹ بال کھیل رہی تھی اور سوچ رہی تھی اتنی دیر سے اس طرح سمندر پر کھیلنا چاہتی تھی لیکن یہ نا سمجھ......

لڑکا کپڑے پہن کر باہر آ گیا تھا۔ اور اسے کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا، پھر اس نے کمرے کو تالا لگایا اور اپنا ہینڈ بیگ کاندھے پر ڈال کر اس کی طرف بڑھا۔ اور اس کی انگلی اس طرح پکڑی جیسے چار سالہ بچی کو ریت میں کھیلنے سے منع کر رہا ہو۔ ''چلو واپس چلیں''۔ اور وہ دل برداشتہ اپنے ساتھ کھیلنے والے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ کر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

لڑکا گاڑی چلا رہا تھا اور تمام دن کے ضائع ہونے پر پیچ و تاب بھی کھا رہا تھا۔ پورے راستے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

لیکن لڑکی لانگ ڈرائیو کی اس سیر پر لڑکے کو تشکر سے دیکھ رہی تھی۔

لڑکا اس کے دیکھنے پر اس کے کھلتے ہوئے چہرے پر نظر ڈال دیتا مگر یوں جیسے وہ اس کے ارادوں کی شکست کی ذمہ دار ہو۔

گاڑی سے اترتے ہوئے جب وہ ہنستے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ تو وہ سوچ رہا تھا کہ عورت کی گولڈن ایج وہی ہوتی ہے جب وہ مرد کے جسم کو محسوس کرنے لگے۔

کھڑکی کے اندر کا منظر

ہمیشہ جب وہ تنہا ہوتی ہے اور تمام گھر خالی ہوتا ہے، گھر کے سب لوگ گئے ہوتے ہیں...... سب لوگ کون، اس کا شوہر اور بچے...... تو دبے قدموں وہ کھڑکی اس کے سرہانے آن کھڑی ہوتی ہے کہ اس کو کھولا جائے۔

کھڑکی کو گھر کے اندر سے نہیں کھولنا تھا۔ بلکہ گھر کے باہر سے جہاں اسے ایک گیٹ سے داخل ہونا تھا اور ایک لمبی راہداری سے گزرتے ہوئے جب وہ کھڑکی کے قریب سے گزرتی تو رُک جاتی۔ پہلی بار ایسے ہی ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کھڑکی خود کو باہر سے کھلوانا چاہتی ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھا کر اس دروازے تک جانا چاہا، جو گھر میں داخل ہونے کے لیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جیسے کھڑکی اس کے پیچھے لپکی، اور اس سے کہہ رہی ہو، مجھے کھولو۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو پیچھے کیا اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے معلوم تھا جب وہ یہ کھڑکی کھولے گی تو اس کے بچے جو یا تو اپنے کوٹ میں پڑے سو رہے ہوں گے یا باہر صحن میں دری پر بیٹھے ناشتہ کر رہے ہوں گے، کمرے میں ان کے کھلونے بکھرے ہوں گے اور اس کا شوہر صحن کے کسی حصے میں کھڑا یا ان کے کوٹ کے پاس بیٹھا ہوگا۔ وہ مسکرائی تھی۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی کے ایک پٹ کو دھکا دیا۔ کھڑکی کھل گئی اس نے کھڑکی پر ٹنگے پردے کو اپنی دو انگلیوں سے سمیٹ کر ایک آنکھ بھر جھانکنے کی جگہ بنائی۔ لیکن اس

جھری سے اسے اندر اندھیرا نظر آیا۔ اس نے اس آنکھ بھر جھانکنے کی جگہ سے ذرا فاصلے سے دیکھا۔ اس کمرے کے دروازے پر جس کے کھلنے سے کمرے میں صحن سے روشنی آتی تھی ایک شخص کھڑا تھا۔ اندھیرے میں وہ صرف اتنا ہی دیکھ سکی۔ دروازے سے لگے ہوئے شخص کے بال کھڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں جو جھکا ہوا زمین سے کسی چیز کو اٹھا رہا تھا۔ کھڑکی سے داخل ہونے والی روشنی سے زمین پر پڑی ہوئی چیز، جو اندھیرے میں پہلے کپڑوں کی گٹھری سی نظر آئی بلبلاتی ہوئی سی...... اور جیسے اس کے کانوں نے سنا، کہیں کانچ کی چوڑیاں بجی ہوں۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، راہداری تو خالی تھی، اس نے پردہ چھوڑ کر پوری راہداری کا چکر لگایا۔ چوڑیاں کہاں بجی تھیں؟

وہ تیزی سے گھر میں داخل ہوئی اور اس کمرے کی طرف بڑھی جس میں وہ کھڑکی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ پردہ ایسے ہی پڑا ہوا تھا جیسا اس نے تین دن پہلے جھاڑ کر کھڑکی پر برابر کیا تھا۔

اس کا شوہر باہر صحن میں بچوں کی ناشتہ کرنے والی دری پر بچوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ بچوں کی آیا باورچی خانے میں دوپہر کے کھانے کے لیے روٹی ڈال رہی تھی، اور روٹی توے پر ڈالنے سے پہلے جب وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان پیڑے کو بڑا کر رہی تھی اس کی چوڑیاں وہی آواز پیدا کر رہی تھیں جو اس نے راہداری میں سنی تھی۔ وہ ہنسی، یہی آواز ہوگی۔ لیکن وہ شخص جو بند دروازے کے ادھر کھڑا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے شوہر نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بچوں کے آگے رکھے ناشتے سے کچھ اٹھا کر اس کے منہ میں ڈالنے کے لیے آگے ہاتھ بڑھایا۔ اور اس خیال کے فاصلے کو پاٹنے سے پہلے ہی، اس نے ہنستے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ لیا اور شوہر کی آنکھوں میں دیکھا جو مسکرا رہی تھیں۔

اس گھر کو چھوڑے ہوئے بھی اسے ایک عرصہ ہوا اب وہ اس گھر کے اندر کا نقشہ بھی بھول چکی ہے۔ لیکن جب بھی وہ تنہا ہوتی ہے تو وہ اس راہداری سے گزرتی ہے اور اس کھڑکی کے پاس رک جاتی ہے جو اس سے کہہ رہی ہوتی ہے کہ اسے کھولو۔ لیکن وہ دوبارہ کھڑکی کھولنے کی جرات بھی نہ کر سکی۔

ایک معمولی کہانی

میں جب اس کے پاس سے گزرتی تھی، وہ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ بہت بار، یہی ہوا۔ میں وہاں سے گزرتی...... اور وہ بھی وہاں سے گزرتا ہوتا۔ مجھے وہ ہوا کی طرح محسوس ہوتا، جو مجھے چھو جاتی تھی۔ مجھ پر کپکپی سی چڑھنے لگتی۔

یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ میرے پاس سے گزرے اور مجھے پتہ نہ چلے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ وہ پیچھے سے آ رہا ہوتا اور میں اس کے بارے میں سوچے بغیر راستہ چل رہی ہوتی۔ لیکن میں ٹھٹک جاتی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی مجھے پتہ چل جاتا کہ میرے پیچھے وہ ہی ہے۔ وہ گزر جاتا، یہ جانے بغیر کہ میں کون ہوں، اور کیا سوچ رہی ہوں۔

وہ صرف اسی راستے میں مجھے نہیں ملتا۔ اکثر کسی بھی کوریڈور میں، کسی بھی جگہ۔ لیکن مجھے اس کے ہونے کا وہاں شبہ نہیں بلکہ یقین ہو جاتا۔ خواہ وہ کسی مجمع میں کسی بہت تیز چلنے والی بھیڑ میں ہی ہو۔

یہ اکثر ہوتا۔ کبھی یہ ہوتا رہتا۔ اور کبھی یہ اکثر نہیں بھی ہوتا۔ اور بہت بہت دن نکل جاتے۔ وہ مجھے نظر نہیں آتا۔ یہ بھی نہیں کہ اگر مجھے وہ نہیں ملتا، تو مجھے کوئی ملال ہوتا یا میں اس کی تلاش میں رہتی۔ میں نے کئی بار اپنی اس حالت پر سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے، جب کوئی اتنی بھیڑ میں پہچان میں آ جاتا ہو، تو وہ بعد میں بھی یاد رہ جانا چاہیے۔ بعد میں کچھ بھی نہیں ہوتا، وہ گزر جاتا یا میں اس کے پاس سے گزر جاتی اور میری حالت پہلے جیسے ہی

ہو جاتی۔ کوئی بے قراری نہیں، کوئی بے چینی، بہت سپاٹ، اور جو میں کام کر رہی ہوتی، وہ بڑی دل جمعی سے کرتی رہتی۔

اس کی ابتدا بھی بہت معمولی طریقے سے ہی ہوئی تھی۔ وہ دن میری زندگی کا شاید مصروف ترین دن تھا۔ مجھے اپنے کاغذات، آنے والے امتحان کے لیے جمع کرانے تھے اور ضروری اسناد، جو میں ابھی تک مختلف امتحانات میں حاصل کر کے آئی تھی، میں نے دوڑ بھاگ کر جمع کیں تھیں اور اب میں سب کو اکٹھا کیے ایک لائن میں کھڑی تھی، جہاں میرے جیسے بہت سے اس لائن میں کھڑے، اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ دن بھر کی تھکن اور بھوک...... صبح سے مجھے کھانے کا ہوش بھی نہیں تھا، وہ کاغذات جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ میں اپنے آگے لمبی لائن کو کبھی کبھی سر نکال کر دیکھ لیتی اور گنتی کرتی جاتی کہ کتنے رہ گئے۔ دھوپ اور بھوک اور تھکن مجھے کم و بیش نڈھال کیے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے پیچھے کھڑی ایک لڑکی سے کہا، مجھے پیاس لگی ہے، سامنے کولر سے پانی پی آؤں۔ تم جگہ کا خیال رکھنا۔ اس نے میرا چہرہ دیکھ کر رضا مندی میں سر ہلایا اور میرے کاغذات تھام لیے۔ میں نے کولر کی طرف دوڑ لگائی، وہاں پہلے سے کوئی جھکا پانی پی رہا تھا۔ ایک ہی نل تھا۔ میں نے کولر کے قریب پہنچ کر اپنی رفتار کم کر دی تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے لگا تھا، جیسے موسم خوشگوار ہو گیا ہے، دھوپ کی تمازت کم ہو گئی ہے اور میری تھکن بھی۔ میں نے اپنے جسم میں چستی محسوس کی، یہ کیا ہوا؟ اچانک۔ اتنی دوڑ لگا کر میں یہاں تک آئی تھی۔ میری سانس پھولنی چاہیے تھی۔ جھکے ہوئے، پانی پینے والے نے سر اٹھایا اور مجھے دیکھے بغیر...... اپنے ہونٹوں کو پونچھتا ہوا، میرے قریب سے گزر گیا۔ میں کولر سے پانی پی رہی تھی، اور اس تبدیلی پر سوچ رہی تھی پانی پی کر سر اٹھا کر، میں نے اُسے دیکھنا چاہا، وہ بہت دور جا چکا تھا۔ مجھے یوں لگا، جیسے بادل کا ٹکڑا میرے سر سے گزر گیا ہو۔ تھوڑی سی پھوار پڑی ہو۔ میں اس غیر معمولی صورتحال کی انتہائی معمولی رد عمل سے محسوس کرتی ہوئی پھر لائن میں آ کھڑی ہوئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے مجھے وہ چہرہ یاد کرنے کا خیال آیا، جو کولر کی ٹونٹی سے پانی پی رہا تھا۔ لیکن لائن کے دھکوں نے مجھے یہ اختیار نہیں

دیا۔ بھاگم بھاگ مچی ہوئی تھی۔ میں بھی اسی میں شریک تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ اب میرا روز آنا ہو رہا تھا۔ اس انسٹیٹیوٹ میں میرا پہلا سال تھا۔ یہاں کے کوریڈرز اور سیڑھیاں اکثر آنے جانے والوں کے تانتے سے بھرے رہتے تھے۔ کوئی کلاس لے کر آ رہا ہوتا اور کوئی جا رہا ہوتا۔ ان کئی دنوں کے بیچ مجھے وہ غیر معمولی واقعہ تو یاد آیا لیکن وہ چہرہ میرے دھیان سے نکل چکا تھا۔ لیکن ایک دن، ایک کلاس میں، میں لیٹ پہنچ رہی تھی، چپلوں کو پاؤں میں اپنے انگوٹھوں سے پھنسائے، تیز تیز چلتے ہوئے، جو میرے پاؤں میں ڈھیلی تھیں اور مجھے کلاس میں وقت پر نہ پہنچانے کی ذمہ دار بن رہی تھیں۔ میں کلاس میں بڑبڑاتی ہوئی گھسی تھی اور بغیر یہ دیکھے کہ کلاس شروع ہو چکی ہے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی لیکن سیٹ پر بیٹھتے ہی مجھے غیر معمولی کیفیت اپنے چاروں طرف دائرے کی شکل میں نظر آئی۔ تر و تازہ، مطمئن کر دینے والی، پاؤں میں پڑے ہوئے ڈھیلے سلیپروں نے تیز تیز چلتے ہوئے جو زخم میرے انگوٹھے اور انگلی کے بیچ ڈال دیا تھا، وہ بھی میں بھلا چکی تھی۔ کلاس میں پڑھانے والے کی آواز کی گونج کے ساتھ کوئی اور گونج بھی تھی، جو بہت مہین، سرسراہٹ میں میرے چاروں طرف تھی۔ میں نے جھکے ہوئے، لکھتے ہوئے خود کو اکسایا، قلم کی نوک کو کاغذ پر ٹکا کر میں نے جلدی سے اپنا سر گھما کر ساری کلاس کو اس طرح دیکھا، جیسے میں گردن کو جھٹکا دے کر اس میں ہونے والے درد کو ٹھیک کر رہی ہوں کہ میری گھومتی نگاہ کے ساتھ میری آنکھیں ایک چہرے پر رکتے رکتے بچیں۔

اب میں دوبارہ لکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، کہاں دیکھا تھا۔ یہ عجیب سا سکون، بلاوجہ میرے جسم میں اسی طرح پہلے بھی، کبھی...... یاد آتے ہی میں بوکھلا گئی۔ قلم نے لکھنا چھوڑ دیا۔ میں نے بے بسی سے اپنی انگلیوں کی طرف دیکھا، جو مجھے مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔

کلاس ختم ہو چکی تھی، سب جا چکے تھے۔ میں بیٹھی رہ گئی۔ ایسا کیوں ہوا، کیا سبب ہے۔ میں اس اَن جانے سکون کو محسوس کرتی رہ گئی۔ پھر نہ جانے کب وہاں سے اٹھی۔

اور یہ اب اکثر ہوتا۔ وہ چہرہ اب پہچان میں تھا جو قریب سے گزرتے ہوئے کلاس میں ہوتے ہوئے، یا کبھی راستے یا کوریڈور میں مڈبھیڑ کا حصہ بنتا۔ اور میں اپنی

حالت پر حیران ہو جاتی۔ لیکن اس کے ماسوا، کبھی میں نے خود کو اس حالت میں نہیں پایا۔ وقت بھی گزرتا رہا۔ میں اپنا کورس پورا کر چکی تھی۔ اور مڈ بھیڑ کے دوران اپنی اس حالت کے باوجود جو مجھے سکون کی ایک ایسی صورتِ حال میں لے جاتی تھی جو میرے لیے ناقابلِ بیان تھی، کے باوجود، میں تجزیہ نہیں کر سکی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور اسی وقت، جب وہ چہرہ میرے قریب یا دور اس زمانے میں ہی ہوتا ہے جس میں، میں موجود ہوتی ہوں، وہ دوپہر ہو یا صبح، سڑک ہو یا کوریڈور۔

گزرتے ہوئے وقت نے اپنے کیریئر کے ٹارگٹ کے دوران کی گہما گہمی نے مجھے رُکنے نہیں دیا۔ اس انسٹیٹیوٹ کے کورس کو مکمل کر کے آگے بڑھ گئی۔ اور یہ نہیں کہ اپنی اس حالت پر حیران نہیں تھی، لیکن وقت نے مجھے موقع نہیں دیا کہ میں تسلی سے کچھ سوچ سکوں۔

پھر بہت دن گزر گئے۔ میرا شوہر، میرے بچے اور میں ...... زندگی ایسی نظر آئی جیسی کسی بھی خوشگوار صورتِ حال میں ہونی چاہیے۔

اس بیچ میں کبھی کبھی اپنی اس کیفیت کو میں یاد کرتی تھی جو طمانیت کی بھرپور زندگی کے باوجود مجھے نہیں ملی تھی۔ میں کبھی کسی خوشی میں اسے تلاش کرنا چاہتی۔ لیکن وہ کیفیت کبھی نہیں ملی۔

پھر ایک دن جب میں ایک بھرپور زندگی گزار ہی چکی تھی، میرے بچے مجھے وہیل چیئر پر بٹھائے ایک دور دراز علاقے کی طرف لے جانے کی تیاری کر رہے تھے جہاں وہ خود بس گئے۔ میں نے ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے، خود کو اسی کیفیت کے حصار میں دیکھا اور اپنی بجھی ہوئی آنکھوں میں وہ روشنی جو عرصہ دراز سے ماند پڑ چکی تھی۔ ہوائی جہاز کی سیٹ پر بیٹھ کر اور پورے سفر کے دوران میں اسی کیفیت کے حصار میں تھی جو بادل جیسی میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، اور مجھے ایک خنکی میں ڈبو رہی تھی۔

میں نے سیٹ پر کمر سیدھی کرنے کے لیے خود کو شاید اونچا کیا تھا۔ یا میں کچھ کھوجنا چاہتی تھی۔ میرے دائیں طرف، تیسری سیٹ پر جانی پہچانی ایک شبیہ میری آنکھوں سے ٹکرائی۔ اور میں عرصہ دراز کے بعد اپنی کیفیت کی اس تکرار پر نڈھال سی ہو گئی۔

نیند میں ڈر

شمس کی آپا قمر کی موت کی خبر اس کے لیے ایسی ہی تھی جیسے سوتے میں وہ اکثر ڈر جاتی تھی۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ خود کو تڑ تڑ، دو ہتڑ مارے۔ لیکن نہیں، وہ جاگ رہی تھی جب اس کو کسی بچے نے آ کر بتایا۔

''آپ کی دوست شمس کی آپا''۔

''شمس کی آپا۔ ہاں۔ کیا ہوا؟''

''وہ مر گئیں۔'' وہ سیڑھیوں پر کھڑی یہ خبر سن رہی تھی، پھسلتے پھسلتے بچی۔ لیکن بچی کیا، وہ پھسلتی ہوئی نیچے آئی۔ نہ ڈوپٹہ لیا نہ چپل، بھاگتی ہوئی شمس کے دروازے پر۔ لیکن وہ راستے میں سوچ رہی تھی ابھی تو شمس کی آپا...... کل ہی تو اپنے سسرال گئی تھیں۔ ان کے شوہر ان کی پتلی پتلی کلائیاں تھامے ٹیکسی میں بٹھا رہے تھے، اور آج ...... اس وقت بہت کچھ اس کو معلوم نہیں تھا، یہی کہ قمر آپا کا پیٹ کیوں پھول گیا تھا۔ اور قمر آپا جو خود بھی بہت کالی تھیں اور بہت دبلی تھیں، لیکن جب ہنستی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے کہیں ستار بج رہا ہو۔ اور یہ کہ خود اس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ وہ اس تمام حساب کتاب میں شمس کی آپا کو دیکھتی تھی۔ لہٰذا جب اس نے ان کے دھان پان شوہر کو دیکھا۔ اور ان کے دھنسے ہوئے گالوں پر منڈھی ہوئی کھال کے اور زیادہ اندر جانے پر اس کا دل ہولنے لگا۔ لیکن پھر وہ آپا کی آنکھوں میں اپنے دولہا کے لیے والہانہ پن دیکھ کر کچھ سہمی سی خوشی میں گھر گئی اور

بھول گئی کہ اتنے بدشکل آدمی کو والہانہ پن سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

وہ جب شمس کے دروازے پر پہنچی تو شمس کے ابا سامنے کھڑے تھے۔ بہت لمبے سے اور جھکے ہوئے ان کے چہرے پر بہت شفقت آمیز یتیمی آج اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس نے چہرے کو روہانسا بنا کر انہیں دیکھا۔ انہوں نے اسے دیکھ کر کہا کہ "جاؤ چپل اور ڈوپٹہ پہن کر آجاؤ۔ قمر کے گھر جانا ہے"۔ جیسے وہ پہلے سے یہ طے کیے تھے کہ اسے ضرور لے کر جائیں گے۔ وہ دوڑتی ہوئی پھر گھر آئی۔ اور اماں کو بتانے کی زحمت کیے بغیر، اس لیے کہ اماں بھی شمس کی آپا قمر سے نہیں ملی تھیں۔ پھر یہ بھی کہ یہ جو کچھ بھی وہ کر رہی تھی شاید بہت اہم اور ضروری تھا۔ وہ واپس بھاگتی ہوئی پھر شمس کے گھر آئی۔ اور پہلے سے روانہ ہونے کے لیے تیار ٹیکسی میں شمس کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر قمر آپا کے گھر چل دی۔

وہ پہلے قمر آپا کے گھر کبھی نہیں گئی تھی۔ لیکن اس کو نہ جانے کیوں یہ خیال تھا کہ قمر آپا کشادہ سے گھر میں رہتی ہوں گی۔ بڑا سا صحن ہوگا۔ جہاں بہت سے گملے رکھے ہوں گے اور ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر قمر آپا سوئٹر بنتی ہوں گی۔ اس لئے کہ وہ اکثر قمر آپا کو سوئٹر بنتا ہوا دیکھتی تھی۔

راستے بھر وہ قمر آپا کی موت کے کسی واضح تصور تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کے سامنے بس ان کا ستار بجتے والی مسکراہٹ والا چہرہ سامنے تھا۔ اور اگر موت کا کوئی تصور اس کے سامنے تھا تو وہ صرف اس بلی کے بچے کا تھا جو اس نے پالا تھا۔ اور جو تیز رفتار رکشے کی ٹکر سے سڑک پر دم توڑ کر مر گیا تھا۔ جب اس نے اس کی خبر بھی پہلی بار سنی تھی اور اس کو مردہ حالت میں دیکھا تھا تو اسے ہلا ہلا کر اس طرح دیکھا تھا جیسے یہ اس کی طرح بنا پڑا ہے۔ جیسے وہ بھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو ایک موت کا ڈرامہ رچا کر ڈرا دیتی تھی۔ اور جب وہ رونے لگتے تو ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ بھی اٹھ کر ابھی بھاگ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ بلی کا بچہ وہیں سڑک پر پڑے پڑے سڑنے لگا۔ وہ بہت دیر تک اس کا چہرہ بھی دیتی رہی کہ اب دیکھنا ہے کہ یہ کب تک بنا پڑا رہے گا لیکن گھر کے بڑوں نے اسے سڑک کے جمعدار کے حوالے کر دیا تھا۔ بلی کے بچے کی موت کے سانحے کو یاد کر کے اس کے دل میں ایک گہری ہوک اٹھی اور اس نے خود کو جھٹکا۔ نہیں! قمر آپا بھی کیا...... لیکن جب تک وہ قمر آپا کے گھر پہنچی تھی جو قطعی کشادہ نہیں تھا۔ تلے اوپر دو منزلہ گھر، چھوٹے چھوٹے کمرے اور تاریک سیڑھیاں، جن کی تنگ سی راہداری میں قمر آپا ایک گہوارے میں کفن میں لپٹی ہوئی پڑی تھیں۔ سارا گھر خاموش بار بار ان کے منہ کو آ کر تک رہا تھا۔

وہ اس حلیے میں قمر آپا کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ جن کے سرہانے قمر آپا کی چھوٹے سے قد کی ماں اپنا منہ بار بار ساڑھی کے پلو سے ڈھک لیتی تھیں اور مری ہوئی قمر آپا کو بار بار ساڑھی کا پلو ہٹا کر التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن کہہ نہیں پا رہی ہوں۔ شمس اپنی آپا کے سرہانے سے ذرا دور ایسی کھڑی تھی جیسی جب وہ قمر آپا کو دلہن بنا کر رخصت کرتے ہوئے کھڑی تھی جب وہ پرائی ہو رہی تھیں۔

وہ بھی مجمع کی دھکم پیل میں قمر آپا کو گھوم پھر کر دیکھ رہی تھی۔ اور اس صورت حال پر ان جانی ہوک میں مبتلا تھی۔ کیا یہ اب بھی حرکت نہیں کریں گی؟ قمر آپا کی موت اس کے لیے زندگی کا اتنا قریب سے پہلا یا شاید دوسرا سانحہ تھا۔ اگر وہ بلی کے بچے کی موت کو بھی اس میں شامل کر لے۔

بہت دنوں تک وہ اس اندھیری راہداری اور وحشت ناک خاموشی اور قمر آپا کی تبدیلی کو یاد کر کے ڈر جاتی تھی جیسے کبھی وہ خواب میں ڈرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ موت اور اس کا بہت بڑا پھیلا ہوا وحشت ناک اندھیرا اس کی یاد سے معدوم ہوتا چلا گیا۔ اس واقعے کو دس پندرہ سال گزر چکے تھے۔ وہ اب کسی کی موت کی خبر سن کر دکھی تو ہو جاتی تھی۔ شاید ڈر بھی جاتی ہو۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے نیند میں ڈر جائے۔

لیکن زندگی کے اس موڑ پر جب وہ ایک اندھیرے کمرے میں اپنی پہلی مباشرت سے گزر رہی تھی تو اچانک اسے ایسا لگا جیسے وہ نیند میں ڈر گئی ہو۔ اور یہ کہ اسے کوئی بری خبر سنانے کے لیے جگا رہا ہو۔ اور یہ کہ شمس کی آپا قمر کا چہرہ جو گہوارے میں رکھا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

بعد کی بے شمار مباشرتوں کے دوران وہ اکثر یاد کرتی رہی کہ پہلی بار ایسا کیوں ہوا تھا جیسے وہ نیند میں ڈر گئی ہو۔

خیال کی رفتار

اس پورے بیس سال کے عرصے میں وہ مجھے یاد نہیں آیا۔ اور اب تو شاید وہ مرکھپ بھی گیا ہو۔ کہاں کا تھا، کہاں جارہا تھا۔ معلوم نہیں، سوائے اس کے کہ وہ میرا ہم سفر تھا۔

آج اچانک یاد آیا۔ اور وہ بھی جب میں انتہائی نیند کے عالم میں اٹھی ہوں اور ایک گلاس پانی کا آخری گھونٹ تک پی کر دوبارہ بستر پر سونے کے لیے بڑھتی ہوں۔ مجھے یاد آیا ایک تیسرے درجے کا کمپارٹمنٹ جس میں وہ اور میں، ہم سفر تھے۔

شروع شروع میں بہت سی ذمہ داریوں نے مجھے بوکھلا دیا تھا، اور ان ذمہ داریوں کے درمیان سے سر نکال کر کبھی میں سانس لینا چاہتی تو اکثر وہ کر بیٹھتی جو عام حالت میں نہیں کرسکتی تھی۔ اس میں میرا یہ سفر بھی شامل ہے۔ ایک رات میں نے اپنے شوہر سے کہا ''مجھے یہ شہر چھوڑ کر کچھ دن کے لیے کہیں جانا ہے''۔

''کہاں جاؤ گی؟'' میرے شوہر کی عادتیں عجیب ہیں۔ وہ کبھی مجھ سے ''نہیں'' نہیں کہتا۔

''لاہور!''

''کس کے پاس؟''

''ارے اتنے لوگ یہاں آتے رہتے ہیں، اور ٹھہرتے رہتے ہیں۔ میں بھی جا کر کہیں ٹھہر جاؤں گی، کسی کے گھر میں''۔

میرا شوہر ہنستا ہے، ''میں نے تو یہ بھی نہیں سوچا، جو میرے دوست میرے پاس ٹھہرتے ہیں میں ان کے گھر جا کر ٹھہر جاؤں''۔

مجھے معلوم تھا اپنے شوہر کا یہ جواب اور واقعی میرے شوہر کی بہت سی عجیب وغریب عادتوں میں، جن کی بناء پر وہ مجھے برداشت کرتا تھا، ایک یہ بھی تھی میزبان ہو۔ مہمان کبھی نہ بنتا۔

لیکن میرے تیور ہمیشہ سے اس کے الٹ رہے۔ میں اپنے احسانوں کا بدلہ فوراً اتروانا چاہتی ہوں۔ اور بہت جلدی، احسان اٹھانے والے کو مجبور کردیتی ہوں کہ وہ بھی مجھ پر احسان کرے۔

تو یہ سفر بھی یوں ہی شروع ہوا۔ صبح بھاگم بھاگ بلیک میں ٹکٹ لے کر میں شالیمار میں چڑھ گئی۔ صرف سیٹ مل گئی، غنیمت تھا۔ ٹرین صبح چھ بجے روانہ ہوئی۔

میں مردانہ کمپارٹمنٹ میں چڑھا دی گئی۔ میرے شوہر نے اپنی خدا حافظ کہنے والی دو انگلیوں کو، ٹرین کو آگے بڑھتے دیکھ کر ہلایا۔ میں نے بھی اپنی آنکھوں سے خدا حافظ کہنے کے ساتھ ساتھ اس سے یہ بھی کہا ''اب نبھاؤ، بچوں کی ذمہ داری تو پتہ چلے گا''۔

لیکن ٹرین جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی گھر چھوٹنے کی اداسی نے کلیجے میں کلبلانا شروع کیا۔ دل اچھل اچھل کر حلق میں آنے لگا۔ دماغ الٹے سیدھے سوالوں میں الجھنے لگا۔ کیا پاگل پن ہے، کیا سوجھی مجھے، بچوں کو چھوڑ کر سفر کرنے کی۔ بچے بھی جب مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ تو ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ امّاں، کیوں جارہی ہو؟

اور پھر بچے کیا جانیں دنوں کی مسافت۔ وہ تو بس ہاں اور نا کے درمیان سوچتے رہ گئے ہوں گے۔ لیکن میں ٹرین کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اور اب دل ہی دل میں شوہر پر غصہ کرنے لگی تھی، کیوں اتنی آسانی سے کہہ دیا کہ جاؤ، تمہیں کون روک سکتا ہے۔ میرے شوہر کا میرے ہر معاملے میں آخری جملہ یہی ہوتا ہے۔

اب ٹرین آگے جارہی تھی۔ اور میں پیچھے جارہی تھی اور بچوں اور گھر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ لیکن پھر برابر میں رکھا ایک ٹین کا ڈبہ مجھے پریشان کرنے لگا۔ اس کا

کونہ میرے کولہے سے ٹکراتا۔ اور میں کھسکنے کی کوشش کرتی۔ ڈبہ جس کا بھی تھا، وہ ڈبے کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھا تھا۔ میں نے ڈبے والے کو نہیں دیکھا۔ اب ڈبے کی چبھن اور گھر کی چبھن سے بچنے کے لیے، میں نے باہر کے منظر دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ ابھی تک میں نے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر تک نہیں ڈالی تھی۔ لیکن اس گھمبیر اداسی سے مل کر مجھے سگریٹ پینے کی طلب ہوئی۔

سگریٹ پینے کا سوچا ہی تھا کہ اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ پورا ڈبہ مردوں سے بھرا تھا۔ سب آڑے ترچھے کچھ شلواروں کے پائنچے اوپر کیے بیٹھے تھے۔ بس ایک مسافر کے ساتھ ایک عورت کونے میں کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ جو سر سے پاؤں تک سفید برقعے میں تھی۔ میں نے بے چینی سی محسوس کی۔ اب اداسی کو سگریٹ پیے بغیر کیسے ختم کیا جائے۔

کوئی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ سوچتے ہی میں نے اپنے برابر والے کو دیکھا۔ وہ اپنے ڈبہ سمیت شاید ٹائٹ گیا تھا۔

سامنے جو بھی بیٹھا تھا۔ وہ شاید مجھے صرف اس قابل سمجھتا تھا کہ گھورا جائے۔ میں نے اپنے چہرے کو تمام تر موڑ کر باہر دیکھنے میں لگا دیا۔ لیکن اداسی اور گھر سے دوری کا احساس بڑھ رہا تھا۔ پھر کراچی سے نکلتے ہی ایک بہت بڑا علاقہ ریت کے ٹیلوں سے اٹا ہوتا ہے۔ وہاں، باہر دیکھنے کے لیے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ میں پھر اندر منہ کر کے بیٹھ گئی۔

ڈبے میں کسی کی طرف دیکھنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ جدھر نظر ڈالتی تھی وہ مجھے گھور رہا ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی آنکھیں، زمین پر اپنے پاؤں کے درمیان جو جگہ خالی تھی، وہاں لگا دیں۔

اتنے میں وہ ڈبہ پھر مجھ سے ٹکرایا۔ میں نے ڈبے والے کو دیکھا۔ اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے بہت کچھ جان چکا ہو۔ دبلا پتلا چہرے پر محنت اور عمر رسیدگی کے آثار نمایاں، لیکن چہرہ بالکل سپاٹ۔ ایسے جیسے اس وقت صرف اسے اپنے ڈبے کی فکر ہو۔ ذرا دیر بعد اس نے ڈبہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ مجھے بات کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ''یہ کنستر آپ نیچے رکھ دیں''۔ میں نے بہت شائستہ لہجہ میں اس سے کہا۔

اس نے مجھے دیکھے بغیر جواب دیا، ''نہیں، اس میں کھانے کی چیزیں ہیں''۔

''اس کنستر میں؟'' لیکن کچھ کہے بغیر، میں کنستر کو گھورنے لگی۔

مجھے کنستر کو گھورتے دیکھ کر اس نے اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر سفر خاموشی سے کٹا۔ لیکن شاید اب اس کی باری تھی۔ اس نے تھوڑا سا مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی نگاہیں ایک بار پھر پاؤں کے درمیان زمین پر گاڑ دیں۔ ہمارے درمیان اجنبیت ان تھوڑی سی باتوں سے ختم ہونے لگی، وہ پھر نئے سرے سے شروع ہو رہی تھی۔ لیکن میں اس اجنبیت میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ گھور چکا اور پھر مڑ کر سامنے والے کو دیکھنے لگا تو میں نے ایک لمبا سانس لے کر زمین کو گھورنا بند کیا۔ اور پھر بات کرنے کے لیے، کوئی سوال سوچنے لگی۔ ''ہاں، تو آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''بارڈر کے ادھر''۔

''بارڈر کے ادھر، یعنی ہندوستان؟''

''ہاں!''

اکثر جب کوئی ملک سے باہر جا رہا ہوتا، خواہ امریکہ جا رہا ہو یا یورپ کے کسی بھی علاقے میں، میں کبھی نہیں چونکتی لیکن جب کوئی کہہ رہا ہوتا، میں ہندوستان جا رہا ہوں یا جا رہی ہوں میں اسے ایسے دیکھتی ہوتی، جیسے ناممکن کام کو انجام دے رہا ہو۔

''اچھا!'' میں اچھل پڑی۔ ''آپ ہندوستان کیوں جا رہے ہیں؟''

''کیوں جا رہا ہوں؟ بھئی میں وہاں رہتا ہوں۔''

''وہیں رہتے ہیں''۔ یہ میرے لیے اور اچنبھا سا تھا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ دبلا پتلا، نحیف کراری سی آواز والا ایک بوڑھا۔ ہوں، ہندوستان میں رہتے ہیں۔ میرے دادا، پھوپھیاں میرے چچا اور سارے پھوپھی زاد چچا زاد سب ہندوستان میں ہی تھے اور ان کے بارے میں سننے کے علاوہ انہیں دیکھنا بہت مشکل تھا۔ ایسے جیسے عنقا کو دیکھنا اب مشکل ہے۔ میں نے ایک بار پھر اس کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

’’یہی کہ آپ ہندوستان میں رہتے ہیں۔‘‘
’’تم کب آئیں یہاں؟‘‘
’’میں؟‘‘ میں نے سوچنا شروع کیا۔ ’’میں تو یہیں کی ہوں‘‘۔ اب میں اُسے پوری طرح کیا بتاتی۔ میں نے ہندوستان نہیں دیکھا، بس سنا ہے۔ لیکن وہ سمجھ گیا تھا۔
’’اب چلی جاؤ‘‘۔
’’اب تو اور مشکل ہے‘‘۔
’’کیوں؟‘‘ میں نے اس کیوں کا جواب بھی اسے نہیں دیا۔
’’بس شاید نہیں جاسکوں‘‘۔ وہ بھی اب باتوں کے پورے موڈ میں تھا۔ اور میں بھی۔ وہ اب اس طرح بیٹھ چکا تھا کہ مجھ سے ہی باتیں کرے گا، اور میں بھی۔ اتنی دیر میں سگریٹ کی طلب پھر پیدا ہوئی۔ میں نے پرس کھولا اور بے اختیار سگریٹ کا پیکٹ باہر نکالنے لگی۔ لیکن اب تو میری عمر سے دگنا، تگنا آدمی مجھ سے باتیں کررہا تھا اور پورا کمپارٹمنٹ مردوں سے بھرا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرا ہاتھ رک گیا۔ اس نے میرے ہاتھوں کی حرکت پر غور کیا۔ شاید سگریٹ کا پیکٹ بھی دیکھ لیا ہو۔ میں نے جلدی سے پرس بند کردیا۔
وہ تھوڑی دیر تک مجھے گھورنے لگا۔ لیکن اب اس کے گھورنے سے میرے اور اس کے درمیان، دس بارہ جملوں کے تبادلے کے بعد اجنبیت ختم ہوچکی تھی۔ میں نے اب زمین نہیں گھوری، بس باہر دیکھنے لگی۔ لیکن اندر دیکھنا بھی اب محال نہیں تھا مجھے بوڑھے سے باتیں کرتے دیکھ کر باقی لوگ شاید اطمینان کا سانس لے کر بیٹھ گئے تھے۔ میری پُراسراریت ختم ہوچکی تھی۔ اتنے میں کوئی اسٹیشن آگیا۔ میں نے جھانک کر باہر دیکھا۔
’’یہ کتنی دیر ٹھہرے گی؟‘‘
’’کون؟‘‘
’’یہ گاڑی‘‘۔ میں نے اس کے ’کون‘ کہنے پر ہنس کر کہا۔
’’شاید دس منٹ‘‘۔
’’ٹھیک ہے۔ میں پانی پی کر آتی ہوں۔‘‘ میں اٹھنے لگی۔

’’تم پانی پینے جاؤ گی؟‘‘
’’ہاں۔ اب اکیلی نکلی ہوں تو......‘‘
میرے کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر تیزی سے نیچے اتر گیا۔ میں بیٹھی رہ گئی۔ کچھ کہا بھی نہیں۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔ وہ پانی والے سے پانی لے رہا تھا، اور پھر چائے والے کا بازو پکڑ کر کھڑکی کے پاس لے آیا۔ ’’چائے دے دو‘‘۔ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے ڈبے میں داخل ہوا۔ میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے سامنے سے جانے والے، اور پانی کا گلاس لے کر آنے والے کی ترت پھرت سے قطعی پتہ نہیں چلتا تھا، کہ یہ ۷۰،۰۶ کے پیٹے میں ہے۔ وہ بہت تیز قدموں سے چلتا ہوا ایک جوان آدمی نظر آرہا تھا۔ میں نے تشکر کی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے پانی پیا اور پھر چائے والے سے گرم گرم چائے کا گلاس۔ پیسے دینے کے لیے میں نے پرس کھولنا چاہا تو گلاس والا جاچکا تھا۔ جب ٹرین چل دی اور میں نے گلاس والے کو چلتی ٹرین سے گلاس دیا تو اس کی طرف دیکھا، ’’پیسے تو یہ لینا بھول گیا۔‘‘
وہ ہنسا، ’’یہ بھی بھول سکتے ہیں؟‘‘
’’ہاں، تو آپ نے دے دیئے؟‘‘
’’یہی سمجھ لو‘‘۔
’’لیکن کتنے دیئے ہیں؟‘‘
’’یہ نہ پوچھنا۔‘‘
’’کیوں؟‘‘
’’پھر تمہیں دینے پڑ جائیں گے۔‘‘
’’لیکن میں دینا چاہتی ہوں۔‘‘
’’اسی لئے تو نہیں بتاؤں گا‘‘ یہ کہہ کے وہ عجیب طرح ہنسا۔ میں بھی ہنسنے لگی۔
اب ٹرین اپنے آہنگ میں رواں دواں تھی۔ اسٹیشن آنے کی وجہ سے مسافروں میں جو کھلبلی سی مچی تھی، اب اس میں بھی سکون تھا۔ میں بھی باہر، مناظر کو اپنی آنکھوں

کے سامنے سے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ سوچ رہی تھی۔ میرے خیالوں کی رفتار سے زیادہ ٹرین کی رفتار نہیں ہے۔ خیال ٹرین سے زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرا ہاتھ پھر پرس کی طرف گیا۔ اور رک گیا۔ میں نے بوڑھے کو چپکے سے دیکھا۔ اور کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ وہ مسافر جو برقعہ پوش عورت کے ساتھ بیٹھا تھا، سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے سارے جسم میں کھلبلی سی مچ گئی۔ ہوں، یہ کمبخت پی سکتا ہے جاہل، تو میں کیوں نہیں پی سکتی، یعنی اے گریڈ کی لیکچرر، اور بھئی پڑھی لکھی۔ میں یہ سوچتے ہوئے بھی حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سگریٹ کا دھواں، باہر جانے کے باوجود ہوا کے ساتھ میری ناک میں گھسا۔ اب تو میں قابو سے باہر تھی۔ میں نے تڑپ کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ ''ہوں، طلب ہو رہی ہے؟'' اس کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔

''ہاں''۔

''تو پیو، چھٹی ہو تو۔ طلب تو ایسی ہی ہوتی ہے۔''

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''اب ڈرو گی تو پھر سارا راستہ ایسے ہی کٹے گا۔'' میں نے اس کے جملوں کے درمیان ہی سگریٹ نکال کر جلائی اور کش لیا۔ اور دل ہی دل میں اس کی حوصلہ افزائی پر اسے دعائیں دیں۔ سگریٹ نے باہر کے منظر اور میرے خیالوں کے درمیان ایک جوڑ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اداسی جو بچے پیچھے چھوڑ آنے پر اور اپنی آوارہ گردی کی دیوانگی پر مجھے ہولا رہی تھی، نسبتاً کم ہو رہی تھی دھواں منہ میں سے نکالتے ہوئے میں اچٹتی سی نگاہ سے کمپارٹمنٹ کے لوگوں کو دیکھ لیتی، جو سگریٹ جلانے اور شروع کے ایک دو کش کے دوران تو مجھے ایسے دیکھتے رہے جیسے ابھی ابھی ان کے سامنے کوئی عجیب وغریب واقعہ رونما ہوا ہے۔ لیکن جوں جوں سگریٹ ختم ہو رہی تھی وہ اب اپنے چہرے ایسے بنا چکے تھے جیسے یہ ان کے معمولات کا حصہ ہو۔ جب تک میں سگریٹ پیتی رہی، بوڑھا خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ میں نے سگریٹ بجھا کر باہر پھینکنا چاہی، اس نے اپنی ہتھیلی بڑھا دی۔ ''لاؤ میں پھینک دوں''۔ میں نے پھر ایک بار تشکر سے ایسے دیکھا۔ اور اب تو یہ تشکر دوبالا ہو چکا تھا میں نے بوڑھے سے جواب تک اپنا ڈبہ گود میں رکھے بیٹھا تھا، کہا ''آپ اسے یہاں رکھ دیں''۔ میں نے اشارہ کیا اور ڈبے کے لیے جگہ بنا دی۔ اس نے ڈبہ گود سے نکال کر میرے اور اپنے درمیان ذرا سی جگہ پر ٹکا دیا۔ اب وہ مزے سے ڈبے پر ہاتھ رکھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں بھی کبھی کبھی مسکرا کر اسے دیکھ لیتی۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے سوال اب وہ مجھ سے کرنے جا رہا ہے۔ اور پھر وہی ہوا۔ ''تم میکے جا رہی ہو یا سسرال؟''

اس کے اس سوال سے مجھے دھچکا سا لگا۔ ''جی، نہ میکے نہ سسرال، بس لاہور جا رہی ہوں۔ دوستوں سے ملوں گی، گھوموں گی، پھروں گی''۔

''میاں نے اجازت دے دی''۔

''ہاں، دے دی''۔

''لڑ کر تو نہیں جا رہی ہو؟'' سوال ایک کے بعد دوسرا میرے لیے گتھی سی بنا رہا تھا اور واقعی، اس کے آخری سوال پر جو وہ کہہ رہا تھا، ''نادانی میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ اکثر عورتیں پریشان ہو کر عجیب عجیب فیصلے کرتی ہیں، لیکن نقصان ان کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ مرد۔ مرد کا کوئی نقصان نہیں ہوتا''۔

تو میں واقعی، خود کو ایک مظلوم اور نادان عورت سمجھ رہی تھی جو اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر واہی تباہی پھرنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ میرے آنسو نکل ہی پڑتے جو میں واپس نہ آتی۔ ''ارے، نہیں، نہیں۔ میں اکیلی سفر کر رہی ہوں۔ لیکن بالکل اپنی مرضی سے، میرے شوہر کون ہوتے ہیں مجھے اجازت دینے والے؟ میرا دل چاہا میں نے انہیں بتایا، انہوں نے فوراً میرا ٹکٹ لے لیا اور مجھے خود بٹھایا ہے''۔

''اچھا۔'' اب سوالوں کی گتھی میں وہ خود لپٹ رہا تھا۔

''شادی کو کتنے سال ہوئے؟''

''پانچ سال۔''

"بچے کتنے ہیں؟"

"چار۔"

ہوں۔ اب ہوں کہتے ہوئے وہ پھر مجھے دیکھ رہا تھا۔ "تو گھومنے کے لیے نکل پڑیں؟"

"جی"۔ میں نے دبک کر کہا، جیسے میں کوئی جرم کرنے جا رہی ہوں۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" کہہ کر وہ بے اطمینانی سے کنستر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگا۔ میری اس جرات پر شاید اس کی اور میری سفر کی یہ دوستی ختم ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہر اسٹیشن پر وہ لپک کر میرے لئے پانی، چائے اور کھانے کا کوئی بندوبست ضرور کرتا۔ اور میں شرمندہ سی ہوئی بیٹھی رہی۔

اب شام ہو چلی تھی۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ بوڑھے نے اپنے کنستر نما ڈبے میں پڑے ہوئے تالے کو ٹھونک بجا کر کھولا۔ اور ایک کاغذ پر بہت سخت سی کوئی چیز نکال کر رکھی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ سخت سی چیز زور لگا کر توڑتا اور مزے سے چبا کر کھانے لگتا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اسے کھاتا دیکھ کر پوچھا۔

"حلوا، خشک حلوا ہے۔ میری بہو نے بنا کر میرے ساتھ کیا ہے۔"

"لیکن آپ نے سارا دن کچھ نہیں کھایا، نہ پیا چائے بھی نہیں۔"

ہاں میں روزے سے تھا۔"

روزہ، میں حیران ہو کر بوڑھے کو دیکھ رہی تھی۔ اب کمپارٹمنٹ میں دھیمی دھیمی سی بتیاں جل رہی تھیں۔ "لیکن روزہ صرف اس حلوے سے کھولیں گے، آپ کچھ اور لیں"۔

"نہیں بس۔ اس سے پیٹ بھر جائے گا"۔ اس نے چہرے کو بہت خوشگوار بنا کر کہا اور میں سوچتی رہ گئی۔

ٹرین تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی، لیکن درمیان میں وہ جہاں جہاں رکی تھی وہاں کے ٹھہراؤ نے اسے لیٹ کر دیا تھا۔ مجھے اندازے کے مطابق دس بجے رات کو پہنچنا تھا،

جبکہ اب ٹرین بارہ، پونے بارہ تک پہنچے گی۔ میرا دل ہولنے لگا۔ "یہ ٹرین لیٹ کیوں ہو گئی؟" میں نے بوڑھے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جو حلوا کھا کر اور کنستر میں دوبارہ تالا لگا کر مزے سے بیٹھا ہوا تھا۔ "ٹرین تو اکثر لیٹ ہوتی ہے، تمہیں کوئی لینے آئے گا شاید"۔

"شاید"۔

وہ اچھل پڑا۔

"ہاں۔" میں نے ہاں کو دیر تک کھینچا۔ لیکن بوڑھے کے اچھلنے پر میرا دل بھی اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

"اگر میرے شوہر کا رابطہ ان سے ہو گیا، جہاں مجھے جانا ہے۔ ورنہ یہ ٹرین دس بجے پہنچتی تو میں آرام سے رکشہ لے کر چلی جاتی۔"

"ارے، اور نہ ہوا تو۔"

تو۔ میں نے ڈر کر اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے فوراً اٹاری کی ٹرین پکڑنا ہے، ورنہ تم کو۔" میں نے سہمے سے انداز میں کہا۔ "بارہ بجے ...... کیسے جاؤں گی؟" اب وہ خوفزدہ نظروں سے مجھ دیکھ رہا تھا اور میں اسے۔ پھر اسٹیشن آ گیا۔

وہ مجھ سے پہلے اتر کر چلا گیا۔ اس نے مجھے خدا حافظ بھی نہیں کہا، میں اپنا سامان اٹھا کر اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ مجھے لینے کوئی نہیں آیا تھا۔ میں ڈرے ڈرے قدموں سے باہر آئی۔ ایک رکشہ میرے قریب آ کر رک گیا۔ "کہاں جانا ہے؟" میں نے پتہ بتایا اور اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے رکشے میں بیٹھنے لگی۔ میں نے دیکھا، بوڑھا دور درخت سے لگا کھڑا تھا اور مجھے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ رکشے میں بیٹھنے کے بعد، رکشے والا رکشہ بھگاتے ہوئے کہہ رہا تھا "تمہارے پیسے بابا نے دے دیئے ہیں۔ جو بچے گا، وہ گھر پہنچ کر لے لینا۔" اور میں سوچ رہی تھی، ہندوستان میں رہنے والے اس بوڑھے سے میرا کیا رشتہ ہے؟

بیس سال کے دوران اور بہت سے واقعات کی طرح میں یہ واقعہ بھی بھول چکی تھی۔ لیکن آج اچانک، انتہائی نیند کے عالم میں، وہ بوڑھا مجھے واقعات کی تمام تر جزئیات کے ساتھ کیوں یاد آیا؟

اُودا

اسے اُودا رنگ بہت پسند تھا۔ آسمان پر دھنک کے رنگوں میں بھی وہ اکثر اودا رنگ ڈھونڈتی۔ پسند تو اس کی تھی ہی، لیکن یہ پسند جب اس کے سامنے ہوتی تو وہ وقت کی دیوار پھلانگ کر کسی دوسرے وقت میں، کسی دوسرے شہر میں، جو اس کے لیے بالکل نیا ہوتا، نکل جاتی۔ یہ غیر مانوس وقت اور یہ اجنبی شہر، وہ حیران ہوتی۔ وقت کے نامانوس ہونے کے باوجود شہر اس کے لیے نیا نہیں ہوتا۔ اُسے ایسا لگتا جیسے وہ یہاں پہلے بھی رہتی آئی ہے۔ وہاں کے گلی کوچے، وہاں کے لوگ، ان کے چہرے، ان کی باتیں، ان کے دیکھنے کا رنگ ڈھنگ، سب ایسا ہے جیسے وہ سب اسے جانتے ہیں اور وہ انہیں۔

لیکن یہ پسند اور یہ رنگ کسی ایک ہی انداز کی نہیں تھی۔ ہر سے جب اُودے بے رنگ سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی اور وہ خوشی کی ننھی سی سانس میں داخل ہوتی، وہ نئے سے اور نئے شہر میں جاتی۔ جہاں سب غیر مانوس وقت میں، مانوس علاقہ تھا، لیکن یہ سب اوروں کے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ کیونکہ اس وقت وہ ان سے علیحدہ ہو جاتی جن کے ساتھ رہ رہی تھی ہمیشہ سے۔

سب اس کی اس غائب دماغی کی وجہ سے، جو ان کے لیے غائب دماغی تھی، اسے

خبطی جانتے، کہ وہ اودے رنگ کے ہوتے ہوئے کہیں چلی جاتی تھی۔

باقی سب نارمل تھا۔ وہ ایک گھر میں رہتی تھی جس میں ایک شوہر، بچے اور اس کی ذمے داریاں، جس میں محبت، غصہ اور اس کی اور اس کے بچوں اور شوہر کی معمولات سے ملتی جلتی چیخ پکار۔

اپنے روزمرہ کے معمولات سے ٹوٹ کر جب وہ دوسری طرف جاتی اور دوسری طرف سے اس طرف دوبارہ آتی تو اس سے وہ حیران ہوتی، اتنا وقت کہاں گزار کر آئی ہے۔ اور تمام تھکن اتار کر اگر وہ گھڑی اسے دیر تک نہیں ملتی تھی تو یہ تھکن اس کے جسم پر چڑھی رہتی تھی یہاں تک کہ وہ نڈھال ہو جاتی تھی۔

یہ اودا رنگ خوش نصیبی کی گھڑی بن جاتا تھا۔ اپنے ہوش و حواس سے بالاتر، لیکن اس دنیا کے لیے وبالِ جان۔

جب ایک بار وہ گاڑی چلا رہی تھی اور اس کا بیٹا اس کے برابر بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا ''لو اماں، آپ گاڑی چلانا سیکھ گئیں۔ اب اتنی رش والی سڑک سے گزر کر آئی ہیں، اب تو یہ گاڑی آپ چلا سکیں گی۔'' اس کا بایاں کان بیٹے کی آواز پر لگا تھا اور وہ خوش ہونے جا رہی تھی کہ سامنے درخت کے اوپر ہوا میں جھومتی ڈالیوں میں سے اودے پھول اسے جھوم جھوم کر دیکھ رہے تھے اور وہ ان کو دیکھتے ہوئے ہی دوسرے وقت میں دوسرے علاقے میں جا پہنچی۔ جب گاڑی درخت سے ٹکرائی، اور اس کے بیٹے کی چیخ گونجی، اس نے دیکھا۔ اس کی فوکسی کا اگلا حصہ ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اگر اس کا بیٹا بریک پر رکھے ہوئے اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں نہ مارتا تو...... لیکن اس کے چہرے پر خوشگوار ماحول تھا۔ اس کا بیٹا اس کی اس حالت پر سہم گیا۔ ''آپ کو خوف نہیں آیا جب گاڑی درخت سے مار رہی تھیں؟ آپ کہاں تھیں؟''

''میں؟'' اس نے جھک کر درخت کی ڈالیوں میں ان اودے پھولوں کی طرف نظر ڈالی، جو اُسے بہکا کر لے گئے تھے۔ لیکن، شاید، وہ اب اُسے نہیں دیکھ رہے تھے۔

وہ اس حالت پر لمبی سانس لے کر بیٹے کو دیکھنے لگی، اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُف،

بیٹے نے ماں کی اس حالت کو لاپرواہی اور غیر ذمے داری کی انتہا سمجھا۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ لیکن وہ ڈری ہوئی نہیں تھی۔ وہ کسی نئے شہر کی لمبی لمبی، کھلی سڑکوں اور ان گھروں کو دیکھ آئی تھی جو اس دنیا سے نئے تھے لیکن اس کے لیے مانوس۔

کہاں ہیں یہ شہر، کہاں بسے ہیں یہ لوگ؟ ان کے دیکھنے کا انداز، ان کے بول چال کا طریقہ، ان کا رہن سہن، سب اس کے لیے مانوس ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود ان کے لیے اجنبی نہیں ہوتی۔

وہ اس وقفے پر، جو اسے اس دنیا میں الگ لے جاتا تھا، کبھی کبھی بہت سوچنے کی تکلیف میں چلی جاتی۔ لیکن یہ زحمت اسے دیر تک اٹھانی نہیں پڑتی، اس کے کام دھندے، زندگی کے رکھ رکھاؤ اسے زیادہ سوچنے نہیں دیتے اور وہ ایک اچھے خواب کی طرح اسے ایک طرف کو سینت دیتی۔

اُودا رنگ اس کی کمزوری نہیں تھا۔ اودا رنگ ایک ایسا راز تھا، جو اس کے بس میں نہیں تھا کہ کسی کو بتائے۔ وہ خود ابھی تک اس راز سے واقف نہ ہو سکی تھی۔ کون سے شہر میں، وہ کون سا وقت ہے جو مجھے یہاں کے انسانوں کی بھیڑ سے نکال کر، دوسری طرف لے جاتا ہے، جہاں دوسری چہل پہل ہے لیکن وہ لوگ یہ نہیں ہیں۔ دیکھنے والے تو صرف یہ کہہ سکتے تھے تم بلائنڈ ہو جاتی ہو۔ تم کہاں کھو جاتی ہو۔ اب وہ کیا بتائے، وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے وہاں سب اُسے ویلکم کر رہے ہوتے ہیں، ان گھروں میں جو اسے ان راستوں اور گلیوں میں ملتے تھے۔ ان میں اس کا اپنا ایک گھر ضرور ہوتا تھا۔ لیکن اس کے دروازے تک پہنچ کر دروازہ کھلنے کی دیر ہوتی۔ کہ وہ اس دنیا میں لپک آتی تھی۔ وہ کبھی کہیں بھی اپنے گھر کے دروازے کو کھول نہیں سکی، لیکن اسے یقین تھا جب وہ اس گھر کے دروازے پر پہنچتی تھی کہ یہ اس کا اپنا ہی گھر ہے۔

ان وقفوں میں، جو اودے رنگ کی لپک نے اُسے مہیا کیے تھے، بے شمار حادثوں کا شکار ہوتے ہوتے بچی۔ اسے یاد ہے ایک دن جب وہ کالج کی چھٹیوں کے بعد کالج کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر کوریڈور میں ایک لہک کے ساتھ چلتی ہوئی آگے

بڑھی، آگے جہاں لڑکیوں کا جھنڈ ایک بڑے سے ستون کے دوسری طرف کھڑا اُسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ ان کے چہروں پر نظر ڈالتی ہوئی بہت احتیاط اور توازن کی چال کے ساتھ ان کی طرف جا رہی تھی۔ سامنے پلر سے ایک لڑکی اودے رنگ کے دوپٹے کو پھیلا کر اوڑھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اودے رنگ کا سامنا اسے وقت کے دوسری طرف لے گیا جہاں وہ کسی اور شہر میں تھی۔ لیکن وہ پلر، وہ آگے بڑھ رہی تھی، لڑکیاں چیخ رہی تھیں۔ پلر کے آر پار ہونا کیسے ممکن تھا۔ اس کا جسم تو وہیں تھا۔ وہ پلر سے ٹکرائی، آناً فاناً اس کا سارا منہ سوج گیا۔ وہ شہر سے واپس آئی کھڑی تھی۔ لڑکیاں منہ کھولے اُسے تک رہی تھیں، ''کون ہے یہ؟''

اور اب یہ وقت اور اس کے وقفے تابڑ توڑ اسے دوسروں سے علیحدہ کرتے تھے کبھی اپنے شوہر، سے کبھی اپنے بچوں سے۔

وہ اس دن ساحل پر کھڑی ہے۔ لوگ، سمندر اور ریت دونوں کو گھلا ملا دینا چاہتے ہیں، سمندر ساحل پر اس کے پاؤں گیلے کر رہا ہے، ایک بچی اس کے برابر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی فراک کو ہلا کر گھوم رہی ہے۔ اس کے بالوں کا ربن اس کے سر کے بالوں کے گُتھر سے کھل جاتا ہے اور پانی میں تیرنے لگتا ہے۔ اس کی نگاہ پانی میں اچھلتے ہوئے ربن تک پہنچتی ہے۔ وہ ربن کی طرف بڑھتی ہے۔ ربن آگے بڑھتا ہے پانی کی کلیلیں کرتی ہوئی موجوں کے ساتھ اور آگے۔ وہ بھی اور آگے بڑھتی ہے۔ ربن اور آگے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں ایک عورت صرف ربن کو پکڑنے کے لیے گہرے پانی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ لیکن عورت اودے رنگ کے طلسم میں داخل ہو چکی تھی جہاں ایک وقت تھا اور کوئی نیا شہر جہاں اس کا گھر تھا جس کے دروازے پر وہ کھڑی تھی۔

لوگ چیخ رہے تھے۔ عورت ڈوب رہی تھی۔ ربن اور آگے جا چکا تھا۔

ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ کہہ رہے تھے'' نہ جانے کون تھی؟ اودے رنگ کے ایک ربن کے پیچھے جان دے دی۔''

زندگی کی کتھائیں

میری طویل نثری نظم کی ایک لائن ہے:

''کہانیاں جو چاند کی روشنی میں بکھری ہوئی تھیں اب کیکر کے درختوں میں بدل گئیں''۔

سمجھنے والے سمجھ گئے۔ زندگی اپنے اتار چڑھاؤ میں جو کہانیاں بناتی ہے اسے دیکھنے والا اور اس سے گزرنے والا، دونوں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ کہہ گزرتے ہیں۔ میں ان ''دونوں'' میں مشترک تھی۔ لہٰذا میرا حق بنتا تھا کہ میں بھی اپنی ٹوٹی ہوئی زبان میں وہ سب کچھ کہہ دوں جو دیکھا سنا اور بھگتا تھا۔

خاموشی میرے نزدیک کفر ہے۔ جب تک بتاؤ گے نہیں کہ کیا دیکھا ہے اور کیسی گذری ہے، دنیا بے علم رہے گی۔

زندگی کی کتھائیں بھی علم کے فروغ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ علم تمہارے کنفیشن کا ہو یا ان کے کنفیشن کا۔ اس لئے کہ دونوں زندگی پر چوٹ لگنے سے بنتے ہیں۔

ابن آدم کے اجتماعی شعور اور لاشعور کو فرائڈ اور اس کے بھی خواہوں نے منطقی اور استدلالی سوال و جواب سے خوب خوب ہمارے ذہنوں کو روشنی فراہم کرنے کی کوشش

کی۔ لیکن ایک کہانی، ایک زندگی، ایک دماغ، ایک خواب کی کتھا، جو ایک آدمی کی ہو یا ایک عورت کی، یہ نہ ہوتی تو یہ سلسلہ کیسے چلتا۔

ذہنی مریضوں کی کہانیاں ڈاکٹر سنتے ہیں اور دوا دیتے ہیں اور اگر بے بس ہوجاتے ہیں۔ تو پاگل خانے آباد ہوجاتے ہیں لیکن ہر پاگل کی ایک کہانی ہے اور ہر اس شخص کی جو پاگل ہونے سے رہ گیا ہو یا جس کے لیے آپ ابھی تک دریافت نہیں کرسکے کہ اسے یہاں رکھیں یا وہاں۔

ایسے ہی روز مرہ اُتار چڑھاؤ کو دیکھتے دیکھتے شاعری شروع کی۔ لیکن شاعری تو وہاں بنتی ہے جہاں خود آپ کے کلیجے پر گھونسہ پڑتا ہے۔ لیکن جب آپ دوسروں کے کلیجے پر گھونسہ پڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک کہانی بنتی ہے۔

اور ذرا تفصیل میں جائیں اور میرے جذباتی انداز کو نظر انداز کردیں۔ تو آپ خود کہیں گے کہ کہانی تو اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ ہاں ہے، یقینی ہے۔ کہانی جو اپنی ایک زبان رکھتی ہے۔ دراصل زبان کی گرہ کشائی بھی کہانی ہے۔ اور یہ گرہ کشائی جو خیال کی بالادستی کے ساتھ جلوہ افروز ہو اور کنفیشن ہو کہ یہ ہے زندگی۔

لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کہانی کی زبان شاعری کی زبان سے الگ ہے۔ میں نے جب۱۹۸۶ء میں پہلی کہانی ''خوشبو'' لکھی تو اس وقت مجھے نثر لکھنا نہیں آتی تھی لیکن زبان کی گرہ کشائی اور خیال کی بالادستی اور کنفیشن نے اسے صرف نظم نہیں بننے دیا۔ وہ ایک کہانی بن گئی۔

لہٰذا نظم لکھنے کے دوران جہاں جہاں ضرورت بنتی گئی، کہانی بنتی گئی۔ جو کہیں مجھے اپنے کنفیشن پر اُکساتی، اور کہیں دوسروں کی زندگی کے۔

دیکھا جائے تو ''گرگٹ کا کھیل'' میری زندگی کا کنفیشن تھا۔ گرگٹ تو بلاوجہ بیچ میں آگیا۔

یوں وہ کہانی کار جو میری اس ٹوٹی پھوٹی گفتگو کو سمجھ پائیں گے اور زبان کی لکنت پر نہیں جائیں گے وہ جان سکتے ہیں کہ اس بیان کے حوالے سے میری کہانیاں کتنے پانی میں ہیں۔



روزمرہ زندگی کے تجربات کی عکاسی، عام بول چال کے اسلوب، بے تکلف اظہار اور نثری نظم سے دلچسپی کے حوالے سے جدید شعری ادب میں عذرا عباس کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ عذرا عباس کراچی میں پیدا ہوئیں اور کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا۔ انہوں نے ۷۰ء کے عشرے میں لکھنا شروع کیا اور نئے لکھنے والوں کی صف میں ممتاز نظر آنے لگیں۔ ان کی طویل نظم ''نیند کی مسافتیں'' ۱۹۸۱ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اور اسے اُردو میں نثری نظم کی بنیادی کتابوں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔ عذرا عباس کی نظموں کے دو مجموعے ''میز پر رکھے ہاتھ'' اور ''میں لائنیں کھینچتی ہوں'' کے نام سے سامنے آ چکے ہیں۔

نظم کے ساتھ ساتھ عذرا عباس نثر میں بھی ایک مختلف انداز کی حامل ہیں۔ ''میرا بچپن'' کے نام سے ان کی خود نوشت کا ایک حصہ سامنے آیا ہے۔ کہانیوں کے علاوہ انہوں نے ایک ناول ''میں اور موسیٰ'' بھی لکھا ہے۔ زندگی کے معمولات کی بے کیف اور اکتا دینے والی یکسانیت میں اچانک نمودار ہو جانے والا کوئی روزن اور اس روزن میں سے جھلکتی ہوئی، کسی اور خواب ناک زندگی کا آسرا..... عذرا عباس کی کہانیاں سفر کا مطالبہ کرتی ہیں اور وہ بھی خیال کی رفتار کے ساتھ۔

شہرزاد
SCHEHERZADE
Rs. 70 /=